# مطالعہ ادب

## قدری تعلیم

مکمل نوٹس معہ نصاب اور ماڈل پیپر

سال اول سمسٹر دوم


**از ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی**

**صدر شعبہ اردو گری راج گورنمنٹ کالج نظام آباد**

# GIRRAJ GOVT COLLEGE NIZAMABAD

(AUTONOMOUS NAAC RE ACCREDITED WITH B)

**REWISED SYLLABUS FOR URDU SECOND LANGUAGE**

**BA.B.Com& B.Sc FIRST YEAR 2016-17**

## SEMESTER- II MODULE II

(Prose and Poetry )

یونٹ1 غزلیں۔مرزا غالبؔ 1۔کوئی دن گر زندگانی اور ہے 2۔کسی کو دے کہ دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو

غزلیں۔حالیؔ۔مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہے اب 2۔دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں

یونٹ2 غزلیں۔مخدومؔ: آپ کی یاد آتی رہی رات بھر 2۔زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی زندگی رنگ وگل کا بیاں دوستو

غزلیں۔ جمیل نظام آبادی 1۔تجھ سے جب پڑ ہی گیا ہے واسطہ اے زندگی

2۔پھوٹے تیرے بھاگ پرندے

یونٹ3۔ 1) نظم ''تیری میری آس وہی ہے'' از: محمد ایوب فاروقی صابرؔ (تبدیل شدہ نصاب)

2۔ نظم ''اے شریف انسانو'' از: ساحر لدھیانوی

3۔ نثر: مرزا غالب کے اخلاق وعادات۔از: الطاف حسین حالیؔ

یونٹ4 1۔ نظم ''اب کے برس'' از: شاذ تمکنت

2۔ انشائیہ ''پڑیے گر بیمار'' از: مشتاق احمد یوسفی

یونٹ5 1۔ افسانہ ''درد کے خیمے'' از: پروفیسر بیگ احساسؔ (تبدیل شدہ نصاب)

2۔ خاکہ ''سلیمان اریب'' از: مجتبیٰ حسین

خارج کردہ نصاب: غزلیں۔قلی قطب شاہ۔نظم ''بارش'' از ظفر علی خان۔افسانہ۔یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے۔از: قرۃ العین حیدر

شامل کردہ نصاب: غزلیں۔جمیل نظام آبادی۔نظم۔تیری میری آس وہی ہے۔از: محمد ایوب فاروقی صابرؔ۔افسانہ۔درد کے خیمے۔از۔ پروفیسر بیگ احساس

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# GIRRAJ GOVT COLLEGE NIZAMABAD

(AUTONOMOUS NAAC RE ACCREDITED WITH B)

MODEL PAPER FOR URDU SECOND LANGUAGE

**BA.B.Com& B.Sc FIRST YEAR 2016-17**

**SEMESTER- II -MODULE II**

(Prose and Poetry )

Time: 2 -1/2hrs Max Marks : 70

**PART A----(حصہ الف)----**

**ذیل میں سے تمام سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔ ہر سوال کے دو نشان مقرر ہیں۔** **5x2=10**

1۔ ساحر لدھیانوی کا تعارف بیان کیجئے۔

2 خاکہ کسے کہتے ہیں۔

3۔ نظم ''تیری میری آس وہی ہے'' میں کس سماجی برائی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

4- مشتاق احمد یوسفی کی تصانیف کے نام لکھو۔

5۔ سلیمان اریب کے رسالہ کے بارے میں لکھئے۔

**PART B----(حصہ۔ب۔)----**

**ذیل میں سے کوئی پانچ سوالات کے جوابات ایک پیراگراف میں لکھیں۔ ہر سوال کے 4 نشانات مقرر ہیں۔** **5x4=20**

1۔ مخدوم کے حالات زندگی مختصر طور پر بیان کیجئے۔

2۔ انسانیت کی فلاح کے لئے کن کن میدانوں میں جنگ کی ضرورت ہے۔

3۔ افسانہ درد کے خیمے کا مرکزی خیال بیان کیجئے۔

4۔ غالب کس طرح غریبوں کی مدد کرتے تھے۔

5۔ شاذ تمکنت کا تعارف بیان کیجئے۔

6۔ سلیمان اریب کے بارے میں مجتبیٰ حسین نے کونسا لطیفہ بیان کیا ہے۔

7۔ پروفیسر بیگ احساس کا تعارف بیان کیجئے۔

8۔ مشتاق احمد یوسفی نے بیماروں کی کتنی اقسام بیان کی ہیں۔

## PART C----(حصہ۔ج۔)----

ذیل میں سے تمام سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔ ہر سوال کے 8 نشانات مقرر ہیں۔ 5x8=40

1۔ نظم ''اے شریف انسانو'' میں جنگ کے کیا نقصانات بیان کئے گئے ہیں۔

(یا) نظیر کی نظم ''توحید'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھئے۔

2۔ اقبال کی نظم فنون لطیفہ کا خلاصہ بیان کیجئے۔ (یا) نظم ''تیری میری آس وہی ہے'' کا مرکزی خیال کیا ہے۔

3۔ مشتاق احمد یوسفی نے بیماروں کی تیمارداری کے لئے آنے والوں کا حال کس طرح بیان کیا ہے۔

(یا) نظم ''اب کے برس'' میں شاعر نے کس بات کو اجاگر کیا ہے۔

4۔ خاکہ ''سلیمان اریب'' کا خلاصہ لکھئے۔ (یا) افسانہ ''درد کے خیمے'' کا خلاصہ لکھئے۔

5۔ ذیل میں سے کوئی دو اشعار کی متن کے حوالے سے تشریح کیجئے۔

1) دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

2) جانور آدمی فرشتہ خدا — آدمی کی ہیں سینکڑوں قسمیں

3) یاد کے چاند دل میں اترتے رہے — چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

4) پھوٹے تیرے بھاگ پرندے — جنگل جنگل آگ پرندے

(یا)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# GIRRAJ GOVT COLLEGE NIZAMABAD

## II INTERNAL EXAMINATIONS MODEL PAPER FOR 2016

**FACULTY OF ARTS /COMMERCE/SCIENCE BA/BCom/BSc Ist YEAR**

**IInd SEMESTER URDU SECOND LANGUAGE**

**Time:30 Minutes** **Max Marks 20**

**NAME OF THE STUDENT:_____ROLL NO _____**

**CLASS_____ Ist YEAR IIndSEMISTER Sign of the Invigilator_____**

**نوٹ: تمام سوالات کے جوابات اسی پرچے میں حل کریں۔ ہر سوال کا ایک نشان مقرر ہے۔**

**I° ذیل کے سوالات کے جواب ایک دو حرف میں قوسین میں دیں۔ 1X5=5**

1 ۔سلیمان اریب کس رسالہ کے ایڈیٹر تھے۔ ( )

2 نظم ''اب کے برس'' کس نے لکھی۔ ( )

3 افسانہ درد کے خیمے کے مصنف کون ہیں۔ ( )

4 چراغ تلے کس کی مشہور تصنیف ہے۔ ( )

5 نظم تیری میری آس وہی ہے میں گاندھی جی نے کس سے خطاب کیا۔ ( )

**II° ذیل میں خالی جگہوں کو مناسب جواب سے پر کریں۔ 1X5=5**

1 نظم اے شریف انسانو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔معاہدے کی سالگرہ پر نشر کی گئی۔

2 ساحر لدھیانوی کا اصل نام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تھا۔

3 رسالہ صبا کے ایڈیٹر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تھے۔

4 غزل کے آخری شعر کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔کہتے ہیں۔

5 ۔۔۔۔۔۔نے غالب کو حیوان ناطق کے بجائے حیوان ظریف کہا۔

1

**II ذیل میں صحیح جواب کا نشان قوس میں لگایئے۔ 1X5=5**

1 کسی شخصیت کی لفظی تصویر والے مضمون کو کہتے ہیں۔

a) انشائیہ b) خاکہ c) افسانہ d) ڈرامہ ( )

2 مصلح الدین کس شاعر کا اصلی نام ہے۔

a) نظیر اکبر آبادی b) حفیظ جالندھری c) شاذ تمکنت d) ساحر لدھیانوی ( )

3 بیماروں کی عیادت کو مزاح کے ذریعے کس نے پیش کیا۔

a) مرزا فرحت اللہ بیگ b) بیگ احساس c) مشتاق احمد یوسفی d) الطاف حسین حالی ( )

4 ہجرت کا کرب کس افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔

a) درد کے خیمے b) پڑیئے گر بیمار c) مردہ بدست زندہ d) حکایات ( )

5 سرخ سویرا کس کا شعری مجموعہ ہے

a) شاذ تمکنت b) مجتبیٰ حسین c) مرزا فرحت اللہ بیگ d) مخدوم محی الدین ( )

**IV ذیل کے سوالات کا درست جوڑ ملایئے۔** **1X5=5**

| | | | |
|---|---|---|---|
| 1 نظم کے لغوی معنی کیا ہیں۔ | ( ) | ( a ) | اے شریف انسانو |
| 2 رسالہ صبا کا دفتر کہاں واقع تھا۔ | ( ) | ( b ) | میر تقی میرؔ |
| 3 تاشقند معاہدے کی یاد میں کونسی نظم لکھی گئی۔ | ( ) | ( c ) | درد کے خیمے |
| 4 ہجرت کا کرب کس افسانے میں پیش کیا گیا۔ | ( ) | ( d ) | موتی پرونا |
| 5 غزل کے اچھے شعر کو کیا کہتے ہیں۔ | ( ) | ( e ) | غزل |
| | | ( f ) | معظم جاہی مارکیٹ |
| | | ( g ) | شاہ بیت |

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

# مطالعہ ادب سال اول۔مکمل سوال جواب۔برائے سمسٹر دوم

# غزل 1 از: غالبؔ

**سوال:** ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔

**1) شعر:** کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔یہ شعر غزل کا مطلع ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں محبوب کے ترک تعلق پر شاعر کے جذبات کا ذکر کیا گیا ہے غالبؔ کہتے ہیں کہ محبوب نے اُن سے وفا نہیں کی۔اس کی جفائیں بڑھتی ہی گئیں۔محبوب کی بڑھتی ہوئی جفاؤں پر شاعر شدید جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کی جفاؤں اور بے وفائیوں اور اس کی دوری کے غم نے ہمیں زندہ رہنے کا موقع دیا۔اُس کی یاد ہمیں زندہ رہنے اور تڑپنے کا موقع دیتی ہے۔ہماری زندگی کے دن غم اور فراق میں گذر رہے ہیں اور ہم نے بھی یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ اگر محبوب کا دیدار نہ ہوتو بھی ہم اُس کی یاد کے سہارے زندگی گذارتے رہیں گے۔انسان کی زندگی میں غم آتے ہیں۔لیکن فطرت کا یہ قانون ہے کہ ہر غم کے بعد خوشی ضرور آتی ہے۔غم کے زمانے میں انسان پر اُمید رہتا ہے اور زندگی میں آنے والی خوشیوں کے انتظار میں زندگی کے دن بسر کرتا رہتا ہے۔

**مرکزی خیال:۔** محبوب کی بے وفائی اور ترک تعلق سے جذبہ عشق اور بڑھ جاتا ہے اور عاشق مزید شدت سے محبوب کو یاد کرنے لگتا ہے اور اپنی زندگی محبوب کی یادوں کے سہارے گذارنے لگتا ہے۔

**2) شعر:۔** آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں غم عشق کی شدت کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعر کہتے ہیں کہ محبوب سے دوری کے سبب ان کے دل میں جو عشق کی آگ لگی ہے۔اور اس کے سبب غم کی جو شدت بڑھی ہے وہ دوزخ کی آگ سے بھی بڑھ کر ہے۔دوزخ کی آگ انسان کو صرف جلاتی ہے جبکہ غم عشق کی شدت سے نہ صرف انسان بلکہ اس کا دل وجگر اور اس کے جذبات سب جل کر راکھ ہوجاتے ہیں۔اس طرح غم عشق کی آگ دوزخ کی آگ سے بڑھ کر ہے۔شاعر نے اپنے عشق کی شدت کو ظاہر کرنے کیلئے غلو کیا۔درحقیقت یہ ہے کہ دوزخ کی آگ کی شدت کا اندازہ اس زندگی میں نہیں کیا جاسکتا۔لیکن شاعر کو علم ہے کہ دوزخ کی آگ انسان کے جسم وروح کو محسوس ہوتی ہے۔جبکہ عشق کے سبب لگی آگ انسان کو بے خود کردیتی ہے۔اسی سبب انہوں نے غم عشق کو بڑا ظاہر کیا۔غم عشق کی آگ کی شدت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے محبوب کی عظمت کا بھی اظہار کیا۔انہیں ان کا محبوب اتنا عزیز ہے کہ اس کی دوری انہیں اس کیفیت سے دوچار کررہی ہے۔

**مرکزی خیال:۔** محبوب سے فراق کا غم اس قدر شدید ہے کہ عاشق کا دل وجان دوزخ کی آگ سے شدید سلگ رہے ہیں۔اس شعر کے ذریعہ عشق کی شدت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

**3) شعر:۔** بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں محبوب کی بڑھتی رنجشوں کا ذکر کیا گیا ہے شاعر کہتا ہے کہ اپنے محبوب کی رنجشیں کئی بار دیکھی ہیں لیکن اس دفعہ رنجشیں کچھ زیادہ ہی ہیں۔عشق میں محبوب کا ناراض ہونا اور روٹھ جانا عام بات ہے اور ایک سچے عاشق کو اپنے محبوب کی تھوڑی سی بے التفاتی بھی رنجش ہی لگتی ہے۔محبوب کی بڑھتی رنجش کا ذکر کر کے شاعر نے اپنے عشق کے شدید جذبے کا اظہار کیا ہے کہ میں تو اپنے محبوب سے بے پناہ عشق کرتا ہوں لیکن وہ اکثر مجھ سے ناراض ہی رہتا ہے اور اب اس کی ناراضگی بڑھ گئی ہے۔ایک طرفہ عشق میں انسان کبھی اپنی عقل اور سوچ سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن کبھی کبھی اسے مرضی کے مطابق کامیابی نہیں ملتی۔تب وہ سوچنے لگتا ہے کہ میں نے کوشش تو بہت کی لیکن حالات ناساز ہونے کے سبب مجھے کامیابی نہیں ملی۔اس شعر میں انسانی جذبات کو اس کیفیت کی طرف غالبؔ نے اشارہ کیا۔

**مرکزی خیال:۔** شاعر کو محبوب کی رنجشوں سے اکثر سابقہ پڑتا ہے۔لیکن اس دفعہ رنجش کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔عشق میں اصرار پر اکثر معشوق لاتعلقی کا اظہار کرتا ہے جس سے عاشق کی تڑپ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔لیکن پھر بھی وہ معشوق کی رنجشوں سے ناراض نہیں ہوتا اور اس کے عشق کی کیفیت بڑھ جاتی ہے۔

**4) شعر:۔دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغام زبانی اور ہے**

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں محبوب سے خط حاصل کرنے کے بعد قاصد کی زبانی محبوب سے مزید کسی پیغام کے انتظار کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ اس کے محبوب نے اُسے قاصد کے ذریعہ خط روانہ کیا۔قاصد شاعر کو اس کے محبوب کا خط حوالے کرتا ہے اور اپنے چہرے سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ کچھ زبانی پیغام بھی ہے۔جو شاعر کے محبوب نے شاعر کیلئے قاصد کے ذریعہ روانہ کیا ہے۔قاصد زبانی پیغام نہیں سناتا ہے لیکن شاعر اپنے محبوب کی فطرت سے واقف ہے اور اسی واقفیت کی بناء وہ سوچتا ہے کہ اس کے محبوب نے اس کیلئے کس قسم کے جذبات پر مبنی پیغام دیا ہے۔یہ پیغام محبت کا بھی ہوسکتا ہے اور نفرت کا بھی۔غالبؔ نے یہاں لطیف اشارہ کیا ہے کہ جب معشوق نے اپنے عاشق کو خط لکھا ہے تو خط میں تمام باتیں لکھی جاسکتی ہیں لیکن انسانوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب کسی کو تحریری پیغام روانہ کرتے ہیں تو خط لے جانے والے کو کچھ زبانی پیغام بھی ضرور دیتے ہیں۔غالبؔ نے اس شعر میں اس کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔نامہ بردہ قاصد ہے جو عاشق اور معشوق کے درمیان رابطہ کی کڑی ہے اور عاشق کیلئے معشوق کا خط لاتے ہوئے وہ عاشق کی راحت کا سامان فراہم کرتا ہے کہ چلو معشوق تو نہیں آیا کم از کم نامہ بر نے معشوق کا خط اور کچھ زبانی پیام تو لایا۔

**مرکزی خیال:۔** نامہ بر کے ذریعہ محبوب سے خط حاصل کرنے کے بعد شاعر کچھ زبانی پیغام کے منتظر ہیں۔لیکن نامہ بر زبانی پیغام سنانے کے بجائے شاعر کا منہ دیکھتا ہے۔تب شاعر محسوس کرتا ہے کہ نامہ بر پیغام اس لئے نہیں سنا رہا ہے کہ اس کے معشوق نے زبانی پیغام میں اس سے نفرت کا اظہار کیا ہوگا۔

**5):۔ قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم وہ بلائے آسمانی اور ہے**

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں ستاروں کے اثرات اور محبوب کی بے وفائیوں اور مظالم کی شدت کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعر کہتے ہیں کہ ستاریز مانے کو قطع

کرتے ہیں زمانے کے قطع ہونے سے عمریں بھی قطع ہوتی ہیں۔علم نجوم کے تحت کہا جاتا ہے کہ ستاروں کی گردش کا اثر انسانی زندگیوں پر پڑتا ہے اور ستاروں کی مخصوص گردش سے انسانوں پر برے حالات آتے ہیں۔ چنانچہ شاعر ستاروں کو ظالم اور بے درد قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جس طرح ستارے زندگی میں ظلم ڈھا رہے ہیں اور مجھ سے بے اتفاقی کرتے ہوئے میری امیدوں آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کر رہے ہیں غالبؔ نے ستاروں کی نحوست کو محبوب کے مظالم سے تشبیہ دی ہے اور اپنے عشق کی شدت کو واضح کیا ہے۔

مرکزی خیال:۔ غالبؔ نے محبوب کے مظالم کو بیان کرنے کیلئے علم نجوم کا سہارا لیا اور ستاروں کی نحوست کو محبوب کی بیدردی سے جوڑتے ہوئے اپنے کلام میں ندرت پیدا کی یہ غالبؔ کا ہی کمال ہوسکتا ہے۔

**6) شعر:۔ ہوچکیں غالبؔ! بلائیں سب تمام اک مرگ ناگہانی اور ہے**

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مقطع ہے۔

**تشریح:۔** غزل کے مقطع میں غالبؔ اپنی زندگی میں آئے بے شمار دکھ درد اور غموں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری زندگی کی تمام بلائیں مجھ پر آ چکی ہیں' صرف اک بلا آنا باقی ہے اور وہ بلا موت ہے۔ موت ناگہانی آتی ہے اس لئے غالبؔ کہتے ہیں کہ زندگی میں آنے والی تمام بلاؤں کے ختم ہوجانے کے باوجود مجھے اک آخری بلاء کا انتظار ہے۔ جو کبھی بھی آسکتی ہے اس موت کے انتظار میں حقیقت میں میں مستقل بلا میں مبتلا ہوں۔ غالبؔ خدا سے شکوہ کرتے ہیں کہ اس نے ان کی زندگی میں غم زیادہ دیئے ہیں اور خوشی کم دی ہے اور غالبؔ کو اپنی گذری ہوئی زندگی سے اندازہ تھا کہ ان کی موت بھی تکلیف دہ ہوگی۔ اس لئے وہ موت کو بلاء کہتے ہیں۔

**مرکزی خیال:۔** موت کا وقت مقرر ہے وہ کبھی بھی آسکتی ہے اور موت کو بلا کہتے ہوئے غالبؔ اس کے منتظر ہیں۔ اور خدا سے شکوہ کرتے ہیں کہ زندگی بلاؤں میں گذری اب موت کا انتظار بھی ایک بلائے مستقبل سے کم نہیں۔

# غزل 2 از: غالبؔ

**سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔**

**1) شعر:۔ کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زبان کیوں ہو**

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مطلع ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں عشق کے سبب ہونے والے غم کے اظہار میں احتیاط کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ عشق میں فریاد کرنا اور رونا شان عشق کے خلاف ہے۔ اسی لئے جب کسی کو دل دے ہی دیا ہے تو پھر آہ وزاری اور فریاد کیسی؟ عشق میں کسی کو دل دے دیا ہے تو عاشق کا سینہ دل سے خالی ہوگیا۔ اب غم کے جذبات کے گھر دل ہی سینہ میں نہ رہا تو شکوہ وشکایت کرنے والی زبان بھی منہ میں نہ رکھیں اور ہر قسم کے شکایت اور شکوہ سے محتاط ہوکر خاموش رہنا چاہئے۔ غالبؔ نے اکثر اپنے کلام میں لطیف خیال پیش کئے ہیں ان کے خیالات میں ندرت ہوتی ہے۔ عشق میں دل دینا محاورہ ہے۔ اس محاورے کے لفظی معنی لیتے ہوئے غالبؔ کہتے ہیں کہ دل دینے سے عشق کا سینہ خالی ہوگیا تو اب زبان کو بھی منہ میں نہ رکھنا چاہئے اور عشق کے سبب ہونے والے غم کی شکایت نہیں کرنا چاہئے۔ اور چپ رہنا چاہئے۔ عشق کے سبب ہونے والے غم کا چرچا کرنا اور محبوب کی شکایت کرنا اپنے عشق کو رسوا کرنے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے سچا عاشق شکایت نہیں کرتا اور غم عشق میں خود ہی ڈوبا رہتا ہے۔

**مرکزی خیال:۔** عشق میں دل دینے کے بعد زبان سے گلے شکوے اور شکایت نہیں کرنی چاہئے۔اور خاموش رہتے ہوئے غم عشق میں ڈوب جانا چاہئے۔یہی سچا عشق ہے۔

**2) شعر:۔ وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں؟ سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو۔**

خو = عادت وضع = رہن سہن، عادت

سبک سر = اپنے مقام سے گر جانا۔ سرگراں = ناراض، خفاء

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں شاعر کی وضع داری کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ اس کا محبوب ناراض اور خفا رہنے کی اپنی عادت نہیں چھوڑتا۔تو میں کیوں اپنے مقام سے گر کر اس سے پوچھوں کہ تم مجھ سے ناراض کیوں ہو۔عشق میں عاشق اور معشوق میں دوری ہوتی ہے اکثر معشوق عاشق سے ناراض رہتا ہے۔عاشق معشوق سے عشق کرتا ہے لیکن اپنی وضع داری اور رکھ رکھاؤ کا لحاظ کرتے ہوئے کبھی معشوق سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم مجھ سے ناراض کیوں ہو؟ عاشق کو احساس ہے کہ میں نے معشوق سے سبب ناراضگی پوچھ لیا اور معشوق نے کچھ جواب دے دیا تو عشق کی وہ گرمی برقرار نہیں رہے گی جو چپ رہنے میں تھی۔اس کے علحدہ عاشق کی وضع داری سے معشوق سے کھچ پوچھنے کو روکتی ہے۔

**مرکزی خیال:۔** معشوق ناراض ہے اور عاشق کو اپنی وضع داری عزیز ہے۔ایسے میں سبب ناراضگی معلوم نہیں ہوتی۔عاشق و معشوق میں دوری برقرار ہے لیکن عشق کا سلسلہ جاری ہے اور ہجر کا غم برقرار ہے۔

**3) شعر:۔ کیا غمخوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو! نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو؟**

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں شاعر کے غم کو فاش کر دینے والے رازداں پر شاعر کے غصے کا اظہار کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ میں غم عشق میں ڈوبا ہوا ہوں محبوب سے دوری کے سبب غم کی شدت ہے۔میرے غم کو دیکھ کر مجھ سے ہمدردی اور غمخواری کا اظہار کرنے کے بجائے میرے غم پر افسوس کرنے لگا۔جس سے میرا عشق ظاہر ہو گیا اور میری ہی رسوائی ہوئی۔اس لئے شاعر غصے میں کہتا ہے کہ ایسی محبت کو آگ لگے۔محبت کے سبب پیدا ہونے والے شدید غم کو میں نے ضبط کر کے چھپا رکھا ہے لیکن میرے ضبط کے باوجود میرے غمخوار نے بے تابی کا اظہار کرتے ہوئے میرے حال پر رحم کا اظہار کر دیا۔دوسروں کے غم کو ظاہر کر دینے والے بے ضبط غمخوار کے بارے میں شاعر کہتا ہے کہ اُسے اپنی محبت کا رازداں نہیں بنا سکتا۔کیونکہ اسے اپنے آپ پر ضبط ہی نہیں۔اس طرح شاعر کہتا ہے کہ یہ کیسی محبت کی آگ ہے جو عاشق کو تو جلا کر رکھ دیتی ہے لیکن عاشق کے ضبط کرنے کے باوجود دوسروں پر عیاں ہو جاتی ہے۔اس شعر میں غمخوار کی شکایت سے زیادہ اپنی محبت کی آگ کے پس پردہ اظہار تذکرہ ہے۔

**مرکزی خیال:۔** محبت کے سبب غم کی شدت ہے۔شدت غم کے باوجود عاشق تو ضبط کر رہا ہے لیکن اس کی بے تابی دیکھ کر غمخوار بے چین ہو جاتا ہے اور فریاد کرنے لگتا ہے کہ شاعر کو اپنی محبت کے رسوا ہونے کا افسوس ہے اور وہ ایسے بے صبر غمخوار کو رازداں بنانا نہیں چاہتا۔) **وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟**

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں محبوب کی بے وفائی پر شاعر کے شدید جذبات کا ذکر کیا گیا ہے۔غالبؔ کہتے ہیں کہ ان کا محبوب سنگ دل ہے۔اور شاعر کے

چاہنے کے باوجود بے وفائی' سرد مہری اور سنگ دلی کا مظاہرہ کرتا ہے۔محبوب کے اس ردعمل سے عاشق مایوس ہے اور عشق میں ناکامی کے سبب اپنا سر پتھر سے ٹکرا کر پھوڑ لینا چاہتا ہے۔سر پھوڑنے کیلئے وہ اپنے محبوب کے گھر کے پتھر کے بجائے کوئی اور پتھر منتخب کرنا چاہتا ہے۔یعنی جب جان دینا ہی مقصود ہو تو محبوب کے در پر سر ٹکرا کر جان دینے کے بجائے کہیں بھی جان دی جاسکتی ہے۔محبوب کو سنگ دل قرار دے کر سنگ آشیاں اور سر پھوڑنا جیسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے غالبؔ نے اپنے شدید جذبہ اور عشق اور محبوب کی شدید سرد مہری کی شکایت بڑی خوبی سے کی ہے۔غزل میں بیان ہونے والے عشق کے روایتی مضامین کو غالبؔ نے اپنی جدت اور ندرت سے بلند خیالی عطا کی ہے۔

**مرکزی خیال:۔** محبوب کی سنگ دلی اور بے وفائی سے مایوس عاشق اپنا سر پھوڑنا چاہتا ہے۔اس کے لئے وہ محبوب کے در پر ٹکرانے کے بجائے کوئی اور جگہ تلاش کرنا چاہتا ہے۔محبوب کی بے وفائی کی شکایت اس شعر میں بنیادی موضوع ہے۔

5) **شعر:۔ قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم! گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟**

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔یہ شعر غالب کے چند مشہور اشعار میں سے ایک ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں غالبؔ نے قفس' آشیاں اور بجلی کے استعارے استعمال کرتے ہوئے ایک بڑے مضمون کو نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔ پرندہ قفس میں ہے وہ دیکھتا ہے کہ باغ میں بجلی گری ہے اس باغ میں اس کا اپنا آشیانہ بھی تھا۔دوسرے دن وہ اپنے قریب بیٹھے پرندے سے دریافت کرتا ہے کہ کل باغ پر بجلی گری تھی اس بجلی کی زد میں کہیں میرا آشیانہ تو نہ تھا۔حقیقت میں قیدی پرندے کا آشیانہ جل جاتا ہے اور ساتھی پرندہ اس حقیقت کو بتانے سے جھجکتا ہے۔ساتھی پرندے کی ہچکچاہٹ پر امید کے ساتھ قیدی پرندہ کہتا ہے باغ میں کئی آشیانے تھے اور بجلی کی زد میں میرا آشیانہ نہیں آیا ہوگا۔اس لئے وہ بے جھجھک پرندے کو احوال سنانے کیلئے کہتا ہے۔غالبؔ نے قیدی پرندے کے ذریعہ ان تمام قیدیوں کے جذبات کی عکاسی کی ہے جو اپنے شہر اپنے وطن میں ہوئے کسی حادثے کی خبر سن کر یہ امید رکھتے ہیں کہ اس حادثے کی زد میں ان کا گھر اور ان کے گھر والے نہیں آئے ہوں۔

**مرکزی خیال:۔** قفس میں اسیر لوگ کسی حادثے کی خبر سن کر اپنے گھر کی خیریت جاننے کیلئے بے چین رہتے ہیں اور گھر لٹ جائے تو اطلاع دینے والے احتیاط کرتے ہیں۔غالبؔ نے اس شعر کے ذریعہ انسانی فطرت کے ان 2 پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

6)۔**شعر:۔ یہ کہتے ہو' ہم دل میں نہیں' پر یہ بتلاؤ کہ جب دل میں تمہیں تم ہو' تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟**

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں محبوب سے عاشق کے سوال کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں تمہارے دل میں نہیں ہوں۔جب تم اس حقیقت کو مانتے ہو کہ میں ہی تمہارے دل میں بسا ہوا ہوں تو تمہارے دل میں میری موجودگی کا اظہار تمہاری آنکھوں سے کیوں نہیں ہوتا۔یعنی دل میں تو محبت ہے لیکن آنکھوں اور بدن کے دیگر اعضاء سے میری محبت اور میری طرف تمہاری اُلفت کا اظہار نہیں ہوتا۔اس شعر کے ذریعہ محبوب سے شاعر کے شکوے کا اظہار ہے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔تمہارے دل میں بسا ہوا ہوں لیکن تمہاری سرد مہری ہے کہ تم اپنی حرکات وسکنات سے میری وفا کا جواب وفا سے نہیں دیتے۔

مرکزی خیال:۔محبوب کی بے وفائی کی شکایت ایک الگ انداز میں کرتے ہوئے غالبؔ کہتے ہیں کہ دل میں محبت ہے لیکن محبوب اس کا اظہار نہیں کر رہا ہے۔

7) **شعر:۔** غلط ہے جذب دل کو شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے۔ نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاش درمیاں کیوں ہو

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں عاشق اور معشوق کے مابین گفتگو کا ذکر کیا گیا ہے۔ عاشق اپنے معشوق سے کہتا ہے کہ ہمارے درمیاں جو آپسی کشش ہے اس کا شکوہ نہیں کرنا چاہئے میں تو تمہیں چاہتا ہوں لیکن تم ہی مجھ سے کھنچے کھنچے اور دور رہتے ہو۔ اس طرح کی دوری اختیار کرنے سے کشاکش ہونا لازمی ہے۔ لہذا تم میری محبت کا جواب محبت سے دو تو یہ دوریاں اور یہ نفرتیں پیدا نہیں ہوں گی۔ اور نہ ہی آپسی گلے شکوے ہوں گے۔ اس شعر میں غالبؔ نے محبوب کو شکایت نہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے محبوب سے اپنی شدید محبت کا اظہار کیا ہے۔

**مرکزی خیال:۔** شاعر محبوب سے گلے شکو نہ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ہماری آپسی کشمکش کی شکایت نہ کی جائے۔ اور آپسی دوریاں ختم کی جائیں۔

**8) شعر:۔ یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسمان کیوں ہو؟**

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں محبوب کے حسن کو فتنہ قرار دیئے جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر اپنے محبوب کے حسن کی تعریف ایک الگ انداز میں کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمہارا حسن خوبصورتی اور خوبصورت ادائیں کسی فتنے سے کم نہیں ہیں۔ تم سے جو بھی محبت کرے گا اُسے برباد کرنے کیلئے تمہارا حسن ہی کافی ہے۔ عاشق کی بربادی کیلئے مزید آسمانی وسلطانی بلاؤں کی ضرورت نہیں۔ انسان جب کسی کے عشق میں ڈوب جاتا ہے تو معشوق کی یاد میں ویران ہو جاتا ہے اسے مزید کسی غم کی ضرورت نہیں۔ اس کی بربادی کیلئے معشوق کی یادیں ہی کافی ہیں۔

مرکزی خیال:۔ شاعر اپنے معشوق کی خوبصورتی کو فتنہ قرار دیتے ہوئے اس کی بالواسطہ تعریف کر رہا ہے۔ اور اس سے شکایت بھی کر رہا ہے کہ تمہارے عشق میں جو برباد ہوا اُسے مزید برباد ہونے کیلئے کسی اور غم کی ضرورت نہیں۔

**9) شعر:۔ یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں عدو کے ہوئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو؟**

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں شاعر کی اپنے محبوب سے شکایت کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے شکوہ کرتا ہے کہ اس نے مجھ سے محبت کرنے کے بجائے میرے دشمن اور رقیب سے محبت کر لی ہے۔ شاعر کا محبوب اسے اپنے عاشق کی آزمائش تصور کرتا ہے۔ تب شاعر کہتا ہے کہ رقیب سے محبت کرنا آزمائش ہے تو پھر ستانا کسے کہتے ہیں۔ اس طرح کے جذبات کے اظہار سے شاعر نے اپنے محبوب سے شدید وابستگی کا اظہار کیا ہے جبکہ ان کا محبوب روایتی ہے۔ اور شاعر سے عشق کرنے کے بجائے کسی اور سے عشق کرنے لگتا ہے۔ اس سے شاعر کے آبگینہ جیسے دل کو ٹھیس لگتی ہے۔

**مرکزی خیال:۔** شاعر کا محبوب رقیب سے محبت کرتے ہوئے اپنے عاشق کو ٹھیس پہونچاتا ہے۔ اور اسے آزمائش تصور کرتا ہے۔ شاعر معشوق کی آزمائش کی تاب نہیں لاسکتا اور اس کے ستانے سے گھبرانے لگتا ہے۔

**10) شعر:۔ کہا تم نے کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو؟**

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** اس شعر میں مترادف الفاظ کی تکرار کے ذریعہ غالبؔ نے محبوب سے شکوہ کیا ہے۔ شاعر اپنے معشوق کی اس بات کا تذکرہ کرتا ہے کہ

غیر سے ملاقات میں رسوائی کیا ہے۔ جبکہ شاعر نہیں چاہتا کہ اس کا معشوق اس کے علاوہ کسی اور سے ملے۔ اپنے عاشق کے بارے میں معشوق کی اس بیبا کی پر طنز کرتے ہیں شاعر کہتا ہے کہ تم نے جو کچھ کہا ہے سچ کہا ہے ٹھیک کہا ہے۔ ایک مرتبہ پھر کہئے۔ لفظوں کی تکرار کے ذریعہ غالبؔ نے اپنے معشوق سے شکوہ اور شکایت میں شدت پیدا کی ہے۔

**مرکزی خیال:۔** محبوب کی بے باکی پر عاشق اپنے محبوب سے طنز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ غیر سے ملنے کو ٹھیک سمجھنا کیا ٹھیک ہے؟

**11) شعر:۔** **نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو؟**

**حوالہ:۔** یہ شعر غالبؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مقطع ہے۔

**تشریح:۔** غزل کے مقطع میں غالبؔ نے اپنے محبوب کے تئیں اپنے روئے کو غلط قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ اس غزل کے سبھی اشعار میں غالبؔ نے اپنے محبوب کو بے وفا' بے مہر' بے مروت قرار دیا ہے اور اسے اس طرح کے طعنے دیئے ہیں لیکن ان طعنوں کے باوجود ان کا محبوب ان کی طرف راغب نہیں ہوا۔ چنانچہ ہمت ہار کر غالبؔ کہتے ہیں کہ میں نے محبوب کو طعنے دے کر اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن طعنے دینے سے کام نہیں چلا اور وہ مجھ پر مہربان دکھائی نہیں دیتا۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ اگر محبوب کو بے مہر کہوں گا تو وہ میری خلاف ورزی کر کے مجھ پر مہربان ہو جائے گا۔ لیکن وہ میرے فریب میں نہیں آیا۔ اور بے وفائی کے اپنے روئیے پر اڑا رہا۔ محبوب کی اس فطرت کو شاعر نے اس شعر کے ذریعہ اجاگر کیا ہے۔

**مرکزی خیال:۔** شاعر محبوب کو طعنے دے کر سدھارنا چاہتا ہے لیکن شاعر کے طعنوں کے باوجود محبوب کی بے مروتی برقرار ہے۔

**سوال: غالبؔ کے حالات زندگی لکھئے اور ان کی شاعری کی خصوصیات بیان کیجئے۔**

**جواب:** مرزا غالبؔ کا تعارف: مرزا اسد اللہ خان غالب (1796-1869) اردو غزل کے نامور شاعر گذرے ہیں۔ اکبر آباد آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد عبداللہ بیگ خاں فوج میں ملازم تھے۔ غالبؔ کے آبا و اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ لیکن غالبؔ نے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ غالب بچپن میں ہی یتیم ہو گئے۔ چچا نصر اللہ بیگ خان نے ان کی پرورش کی۔ غالبؔ نے آگرہ کے قیام کے زمانے سے ہی شاعری شروع کر دی تھی اور میرؔ نے ان کے ابتدائی کلام کی تعریف بھی کی تھی۔ غالب کی شادی الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی اُمراؤ بیگم سے ہوئی۔ شادی کے بعد وہ دہلی منتقل ہو گئے۔ قلعہ دہلی سے وابستہ رہے۔ استاد ذوقؔ کے انتقال کے بعد بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے اور ان کی حکومت کی جانب سے پذیرائی بھی ہوئی۔ غالبؔ نے اردو غزل گوئی میں اپنا الگ مقام بنایا وہ دوسروں کی راہ پر چلنے سے کتراتے تھے۔ ابتداء میں فارسی میں شاعری کرتے رہے۔ بعد میں اردو شاعری کی۔ غالب کا اردو دیوان مختصر ہے۔ لیکن اسے عالمی طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ موضوعات اور انداز بیان میں جدت' شوخی' ظرافت اور دیگر زبان و بیان کی خوبیاں انہیں اردو کا ایک منفرد شاعر بناتی ہیں۔ غالبؔ نے بغیر القاب و آداب استعمال کئے آپسی گفتگو کیطرح خط لکھے جو بہت مشہور ہوئے۔ مجموعی طور پر غالب نے اردو شاعری کو نئی فکر عطا کی اور آج بھی ان کی شاعری سے نئے مفاہیم تلاش کئے جا رہے ہیں۔ غالبؔ کا انتقال دہلی میں ہوا اور وہ درگاہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے احاطہ میں دفن ہیں۔

**غالبؔ کی شاعری کی خصوصیات:** ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

غالب کے بارے میں عبادت بریلوی لکھتے ہیں، ''غالب زبان اور لہجے کے چابک دست فنکار ہیں۔ اردو روزمرہ اور محاورے کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس کی سادگی دل میں اتر جاتی ہے۔'' عبدالرحمٰن بجنوری لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ''وید مقدس'' اور ''دیوان

غالب''۔''

اردو شاعری میں مرزا غالب کی حیثیت ایک رر خشاں ستارے کی سی ہے۔انہوں نے اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونک دی۔اسے نئے نئے موضوعات بخشے اور اس میں ایک انقلابی لہر دوڑا دی۔ان کی شاعری میں فلسفیانہ خیالات جا بجا ملتے ہیں۔غالب ایک فلسفی ذہن کے مالک تھے۔ انہوں نے زندگی کو اپنے طور پر سمجھنے کی بھرپور کوشش کی اور ان کے تخیل کی بلندی اور شوخی فکر کا راز اس میں ہے کہ وہ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

غالب انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔اس کے بنیادی معاملات و مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں۔اس کی ان گنت گتھیوں کو سلجھا دیتے ہیں۔انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتے ہیں۔اور نظام کائنات میں اس کو نئے آسمانوں پر اڑاتے ہیں۔غالب کی شاعری اس اعتبار سے بہت بلند ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شاعری کے انہیں عناصر نے اُن کو عظمت سے ہمکنار کیا ہے۔لیکن جس طرح ان کی شاعری میں ان سب کا اظہار و ابلاغ ہوا ہے۔وہ بھی اس کو عظیم بنانے میں برابر کے شریک ہیں۔غالب کی شاعری کا اثر حواس پر شدت سے ہوتا ہے وہ ان میں غیر شعوری طور پر ایک ارتعاش کی سی کیفیت پیدا کرتی ہے اور اسی ارتعاش کی وجہ سے اس کے پڑھنے اور سننے والے کے ذہن پر اس قسم کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ان کے موضوع میں جو وسعتیں اور گہرائیاں ہیں اس کا عکس ان کے اظہار و ابلاغ میں بھی نظر آتا ہے۔ان گنت عناصر کے امتزاج سے اس کی تشکیل ہوتی ہے۔

• غالب کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا منطقی اور استدلالی انداز بیان ہے بقول پروفیسر اسلوب احمد انصاری:''یعنی غالب صرف جذبات کا تجزیہ ہی نہیں کرتے بلکہ ان میں باہمی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔محبت ان کے لیے کوئی ایسا جذبہ نہیں جو فطری طریقے سے دلکش محاکات میں ڈھل جائے۔بلکہ یہ ایک گرم تیز رو ہے جو پوری شخصیت کے اندر انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔غالب صرف اشاروں سے کام نہیں لیتے بلکہ اپنے نرم و لطیف،احساسات و کیفیات کا تجزیہ کرتے اور ان پر استدلال کرتے ہیں۔''

غالب کے اس اندازِ بیان کو سمجھنے کے لئے یہ اشعار ملاحظہ ہوں کہ استدلال کا یہ انداز کس طرح شاعر کے جذبات و احساسات کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب　　کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

**قول محال کا استعمال:** غالب نے قول محال کے استعمال سے بھی اپنی شاعری میں حسن و خوبی پیدا کی ہے۔قول محال سے مراد یہ ہے کہ کسی حقیقت کا اظہار اسطرح کیا جائے کہ بظاہر مفہوم عام رائے کے الٹ معلوم ہو مگر غور کریں تو صحیح مفہوم واضح ہو۔قول محال دراصل ایک طرف ذہنی ریاضت ہے۔اس سے ایک طرف اگر شاعر کی قوتِ فکر کا انحصار ہوتا ہے تو دوسری طرف قاری کو بھی ذہن و دماغ پر زور دینا پڑتا ہے۔اسسے شاعر لطیف حقائق کی طرف اشارہ ہی نہیں کرتا بلکہ حیرت و استعجاب کی خوبصورت کیفیات بھی پیدا کرتا ہے۔اس سلسلے میں غالب کے اشعار دیکھیں:

ملنا تیرا گر نہیں آساں تو سہل ہے　　دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

**تشکک پسندی:** غالب کی شاعری میں تشکک پسندی کا پہلو بہت اہم ہے۔جو بحیثیت مجموعی غالب کی شاعری کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔اس کی ایک وجہ غالب کا فلسفیانہ مزاج ہے۔جبکہ دوسری وجہ غالب کا ماحول ہے۔غالب نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ ایک ہنگامی دور تھا۔

ایک طرف پرانی تہذیب مٹ رہی تھی اور اس کی جگہ جدید تہذیب اور تعلیم اپنی جڑیں مضبوط کر رہی تھی۔ یوں انتشار اور آویزش کے اس دور میں اُن کی تشکک پسندی کو مزید تقویت ملی۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

**معانی دار پہلو:** حالی نے بڑے زور وشور کے ساتھ غالب کی شاعری کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس میں معانی کی مختلف سطحیں موجود ہیں۔ غالب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں۔ جن کی فلسفیانہ، سیاسی اور شخصی تفسیر ہم کر بیک وقت کر سکتے ہیں۔ ایسے اشعار ان ترشے ہوئے ہیروں کی مانند ہیں جن کی آب وتاب اور خیرگی سے ہر زاویہ نگاہ سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج تک غالب کی کئی شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

**رمز وایمائیت:** غالب نے اپنی شاعری میں رمز وایمائیت سے بھی حسن پیدا کیا ہے۔ انہوں نے زندگی کی بڑی بڑی حقیقتوں اور گہرے مطالب کو رمز و ایما کے پیرائے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے اردو غزل کی روایت میں تصوف نے جو رمز وایمائیت پیدا کی اسے اپنے لیے شمع راہ بنایا۔ یوں انہوں نے سیاسی اور تہذیبی، معاشرتی موضوعات کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا اور انفرادی رنگ کے پردے میں اجتماعی تجربات کی ترجمانی کی۔ اس طرح سے رمزیت اور ایمائیت کا رنگ ان کی شاعری پر غالب نظر آتا ہے۔

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

**لطافت خیال اور نکتہ آفرینی:** غالب کی شاعری میں نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے غالب عام روش سے ہٹ کر چلنا پسند کرتے تھے۔ شاعری میں بھی الگ روش پر چلنا پسند کرتے تھے۔ انہوں نے لفظی سے زیادہ معنوی نکتہ آفرینی پر زور دیا۔ اس طرح وہ مومن سے ممتاز اور برتر ہیں۔ ان کی نکتہ آفرینی سلاست، گہرائی اور معنویت سے پر ہے۔ اس میدان میں غالب نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اس کی وضاحت اُن کے درج ذیل اشعار سے ہوتی ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے میرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

**زندگی کی محرومیاں:** غالب کی ذاتی بھی تلخیوں اور محرمیوں کی زنجیر ہے۔ بچپن میں باپ کی موت، چچا کی پرورش، اُن کی شفقت سے محرومی، تیرہ سال کی ناپختہ عمر میں شادی کا بندھن، بیوی کے مزاج کا شدید اختلاف، قرضوں کا بوجھ۔ ان سب نے غالب کو زمانے کی قدر شناسی کا شاکی بنا دیا۔

کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

**طنز ومزاح شوخی وظرافت:** شوخی وظرافت غالب کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ عملی زندگی میں وہ خوش باش انسان تھے۔ اسی لیے حالی انھیں حیوان ظریف کہتے ہیں۔ انتہائی کٹھن حالات میں بھی وہ زندہ دلی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ انہیں زمانے نے نجانے کتنے دکھ دیئے لیکن غالب پھر بھی ہنسے جاتے ہیں۔ ان کی ظرافت میں محض شوخی ہی کام نہیں کر رہی، جس طرح غالب کی شخصیت پہلو دار شخصیت ہے اسی طرح غالب کی ظرافت کی بھی

متعدد سطحیں ہیں۔ان کی شاعری میں طنز وظرافت کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔غالب کے کچھ طنزیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن　　دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

**زندہ دلی اور خوش طبعی:** غالب کی شاعری میں طنزیہ اشعار کے ساتھ ساتھ شوخی اور خوشدلی کا پہلو بھی بڑا نمایاں ہے۔چنانچہ ان کے ہاں ایسے اشعار بھی بہت ہیں جنہیں خالص مزاح کا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔اصل میں غالب زندگی کی چھوٹی چھوٹی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔اگرچہ وہ زندگی کی تلخیوں سے آگاہ ہیں لیکن انہیں زندگی سے والہانہ لگاؤ بھی ہے۔غالب ایک فلسفی شاعر تھے۔انہوں نے زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی اور پھر اپنے انکشافات کو ہلکے پھلکے انداز میں پیش کر دیا۔غالب کے کچھ مزاح سے پھرپور اشعار ملاحظہ ہوں:

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا　　جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ　　پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

**فارسی زبان کے اثرات:** غالب کو فارسی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا۔اس لئے ان کی شاعری میں فارسی زبان کے اثرات زیادہ ہیں۔خود فارسی شاعری کے بلند پایہ شاعر بھی تھے۔اور فارسی کو اردو سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔چنانچہ فارسی زبان کے اثر سے ان کی زبان میں شیرینی حلاوت اور شگفتگی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔انہوں نے فارسی الفاظ استعمال کر کے اور ان کی ترکیبیں تراش کر نہ صرف اردو زبان کے دامن کو وسیع کیا بلکہ اپنی شاعری میں بھی ایک نکھار اور رعنائی پیدا کر لی۔یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں　　لیکن اب نقش و نگارِ طاق نسیاں ہو گئیں

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی　　یہ جو اک لذت ہماری سعی لا حاصل میں ہے

**سادہ انداز بیان:** مشکل الفاظ و تراکیب کے ساتھ ساتھ غالب کے ہاں آسان زبان بھی موجود ہے۔غالب نے پیچیدہ مسائل کے اظہار میں عموماً فارسی ترکیبوں سے کام لیا ہے اور سنجیدہ مضامین کے لیے الفاظ کا انتخاب بھی اسی مناسبت سے کیا ہے۔لیکن سیدھے سادے اور ہلکے پھلکے مضامین کو غالب نے فارسی کا سہارا لیے بغیر رواں دواں اور سلیس اردو میں پیش کیا ہے۔زبان کی سادگی ان اشعار کی معنوی قدر و قیمت پر کوئی بڑا اثر نہیں ڈالتی بلکہ ان کے حسن میں اضافہ کرتی ہے۔کیونکہ یہ سادگی شعری تجربے سے ہم آہنگ ہے۔اس سلسلے میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب　　مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

موت کا ایک دن معین ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

**جدت ادا:** غالب ذہنی اور طبعی اعتبار سے انفرادیت پسند تھے۔کسی کی تقلید کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔وہ وبائے عام میں بھی مرنا نہیں چاہتے تھے۔غالب کی یہی جدت ادا ان کی شاعری میں نئے نئے گل کھلاتی ہے۔مرزا سے پہلے تمام شعراء کا طریقہ شعر گوئی یہ رہا کہ وہ قدیم خیالات میں کچھ ترمیم کر کے پیش کر دیتے تھے۔لیکن غالب کے ہاں ایسا نہیں۔اُن کی جدت طبع اور انفرادیت پسندی ہمیشہ نئے نئے خیال ڈھونڈنے پر مجبور کرتی رہی۔چنانچہ اُن کی شاعری میں ہمیں رنگا رنگی اور بوقلمونی محسوس ہوتی ہے۔اگر کبھی مرزا نے کسی قدیم خیال کو ادا بھی کیا ہے تو اس انداز میں کہ شانِ استادی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

**تصوف:** غالب کوئی باقاعدہ صوفی شاعر نہ تھے اور نہ اُن کو تصوف سے دلچسپی تھی لیکن پھر بھی ان کی شاعری میں بعض مقامات پر تصوف کے عناصر ملتے ہیں جس کی بنیادی وجہ فارسی شاعری میں تصوف کی روایت کی موجودگی ہے اس کے علاوہ اس دور کے حالات بھی تصوف کے لیے خاص طور پر سازگار تھے۔ طبیعتیں بھی غم والم اور فرار کی طرف مائل تھیں۔ لیکن غالب نے تصوف کو محض رسمی طور پر ہی قبول کیا۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود  پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا  ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب کا تصور عشق

غالب کے ہاں حسن وعشق کے تصورات اگر چہ وہی ہیں جو صدیوں سے اردو اور فارسی شاعری میں اظہار پاتے رہے ہیں۔ تاہم غالب کی فطری جدت پسندی نے ان کو صرف انہی موضوعات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے ذاتی تجربات ومحسوسات کی روشنی میں حسن وعشق کے بارے میں انہوں نے اپنی انفرادیت قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

# غزل 1  از: الطاف حسین حالؔی

**سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔**

**1) شعر:۔ مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہے اب  چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب**

**حوالہ:۔** یہ شعر حالؔی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ شعر غزل کا مطلع ہے۔

**تشریح:۔** شاعر حالؔی غزل کے مطلع میں کہتے ہیں کہ ان میں شکایت کو ضبط کرنے کی تاب نہیں ہے۔ میں پھر بھی چپ ہوں۔ اگر مجھے اکسایا گیا تو میں شکایت کرتے ہوئے تمہارے تمام راز بیان کردوں گا۔ حالؔی کی شکایت اپنے محبوب سے ہوسکتی ہے۔ یا زمانے سے۔ کیونکہ حالؔی شریف انسان تھے۔ انہوں نے عشقیہ شاعری سے اپنے آپ کو دور ہی رکھا۔ بلکہ اپنی شاعری کے ذریعے اصلاح کا کام کیا۔ حالؔی کو اپنے زمانے سے شکایت تھی کہ اس وقت قوم بے عمل ہوگئی تھی۔ اس لئے حالؔی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا ہے۔ اب میں قوم کی حالت اور اس کی حقیقی تصویر دکھانے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔

**مرکزی خیال:۔** زمانے اور قوم کی بے عملی اور بدحالی دیکھ کر شاعر بے چین ہوگیا ہے۔ اور وہ اب اپنا فریضہ سمجھ کر قوم کی اصلی حالت بیان کردینا چاہتا ہے۔

**2) شعر:۔ آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزا  کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب**

**حوالہ:۔** یہ شعر حالؔی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** شاعر حالؔی غزل کے اس شعر میں کہتے ہیں کہ بڑی کوشش کے بعد جب مجھے اپنے محبوب حقیقی خدا کی یاد اور اس سے ملنے کی تمنا میں کچھ مزا آنے لگا تو لوگ مجھے ڈرانے لگے کہ یہ وہ عشق ہے جس میں بڑی قربانی دینی پڑتی ہے۔ انسان کو اس زندگی میں دیدار الٰہی نصیب نہیں ہوسکتا۔ اس کیلئے تو اسے مرنا ہوگا۔ تب ہی اسے حشر کے بعد اپنے حقیقی محبوب کے دیدار کا موقع ملے گا۔ دنیا کی زندگی میں بھی انسان جب کسی کام کی دھن میں لگ جاتا ہے۔ تو اس کام میں کامیاب ہونے کیلئے اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تب ہی کہیں جا کر کامیابی اس کے ہاتھ لگتی

ہے۔اگر انسان مشکلات کو دیکھ کر کوئی کام شروع ہی نہ کرے تو اسے کامیاب نہیں مل سکتی۔

**مرکزی خیال:۔** عشق کی راہ میں مشکلات درپیش رہتی ہیں۔انسان مشکلات سے نہ گھبرائے تو اسے اپنی منزل ضرور ملے گی۔

**3)شعر:۔ لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات اے دل سنبھل وہ دشمن دیں مہرباں ہے اب**

**حوالہ:۔** یہ شعر حالؔی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** غزل کے اس شعر میں حالؔی کہتے ہیں کہ حسینوں سے محبت کرنا بڑی غلطی ہے۔اس سے انسان اپنے مقصد سے دور ہو جاتا ہے کیونکہ وہ انسان کو اپنے جال میں پھانس لیتے ہیں اور اسے اپنے مقصد سے دور کر دیتے ہیں۔مرد اگر خوبصورت عورتوں کے جال میں پھنس گیا تو وہ اپنے دین اور دنیا کے سیدھے راستے سے بھٹک سکتا ہے۔عورتیں اگر حسین مردوں کے جال میں پھنس گئیں تو اپنی عزت کھو سکتی ہیں اس لئے تجربہ کار شاعر لوگوں کو مشورہ دے رہا ہے کہ وہ حسینوں کے فریب سے اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔

مرکزی خیال:۔حسین لوگ اپنے حسن کو جال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔اور معصوم انسانوں کو اپنے حسن کے جال میں پھانسنے کے منتظر رہتے ہیں۔شاعر اس طرح کے دھوکے باز لوگوں سے بچے رہنے کی تلقین کر رہا ہے۔

**4)شعر:۔ ہے وقت نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز ہاں جذب دل مدد کہ دم امتحان ہے اب**

**حوالہ:۔** یہ شعر حالؔی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** شاعر حالؔی غزل کے اس شعر میں کہتے ہیں کہ ان کی موت کا وقت قریب آ گیا ہے۔لیکن ان کا محبوب ابھی تک نہیں آیا۔جبکہ اس کے لئے انہوں نے زندگی بھر اس کا انتظار کیا۔اس لئے وہ اب اپنے دل سے مدد کی درخواست کر رہے ہیں کہ وہ ان کی مدد کرے۔اور کم از کم مرتے وقت خدا کو یاد کرنے کی توفیق، حوصلہ اور ہمت عطا کرے۔انسان زندگی بھر خدا کو یاد کرتا ہے اور اسی کی عبادت کرتا ہے۔اگر مرتے وقت اس کی زبان سے کلمہ ادا ہو جائے تو اس کی آخرت سنور سکتی ہے۔شاعر اسی جانب اشارہ کر رہا ہے۔

**مرکزی خیال:۔** زندگی خدا کی یاد میں گزاری۔مرتے وقت خدا یاد آ جائے تو انسان کی آخرت بہتر ہو سکتی ہے۔اس کیلئے دل کی مدد کی ضرورت ہے۔

# غزل2 از: الطاف حسین حالؔی

**سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔**

**1)شعر:۔ دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں رخنے نکلیں گے سینکڑوں اس میں**

**حوالہ:۔** یہ شعر حالؔی کی غزل سے لیا گیا ہے۔یہ شعر غزل کا مطلع ہے۔

**تشریح:۔** غزل کے مطلع میں حالؔی کہتے ہیں کہ دنیا کی مجلسوں اور محفلوں میں جا بجا برائیاں اور غلطیاں ہیں۔اس لئے ہمیں ان کی طرف نظر نہیں کرنی چاہئے۔انسان دوسروں کو بُرا کہتے کہتے تھک جائے گا۔اس کی توانائی ضائع ہو گی۔دنیا تو نہیں سدھرے گی لیکن بُرا کہنے والے کو پریشان ہونا پڑے گا۔اس لئے حالؔی انسانوں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں۔

**مرکزی خیال:۔** سادگی پسند انسان دنیا کی پرواہ کئے بغیر اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔اور وہ چپکے سے اپنی زندگی گذار کر چلے جاتے ہیں۔جبکہ

خدا نے انسانوں کو یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ خود سیدھے راستے پر چلیں۔اور غلط راہ پر چلنے والوں کو سیدھا راستہ دکھائیں۔

**2)شعر:۔ ہو نہ بینا تو فرق پھر کیا ہے         چشم انسان و چشم نرگس میں**

**حوالہ:۔** یہ شعر حالؔی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** غزل کے اس شعر میں حالؔی انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کو چشم بینا رکھنا چاہئے۔اور دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیچھے خدا کی مرضی کو پہچاننا چاہئے۔ظاہری نظر انسان کو کچھ اور ہی بتاتی ہے۔انسان دیکھ رہا ہے کہ بادل سے پانی برس رہا ہے۔زمین سے کھیتی اُگ رہی ہے۔انسان کام کرے تو اسے دو وقت کی روٹی مل رہی ہے۔یعنی ہر بات اور ہر کام کے پیچھے ایک سبب ہے۔بغیر سبب کے کچھ نہیں ہوتا۔لیکن پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدا کی مرضی اور حکم سے ہو رہا ہے۔بادل محتاج ہے پانی برسانے میں اللہ کے حکم کے۔کیونکہ ہر بادل سے پانی نہیں برستا۔زمین محتاج ہے کھیتی اُگانے میں کیونکہ ہر زمین سے کھیتی نہیں اُگتی۔اسی طرح انسان کوئی کام کرنے میں اللہ کی مدد کا محتاج ہے۔اس لئے حالؔی کہتے ہیں کہ ہمیں کائنات کے اسرار میں غور کرنا چاہئے۔ہمیں خدا کی قدرت کا پتہ چلے گا اور ہم اس کے شکر گذار بندے بن سکیں گے۔

**مرکزی خیال:۔** انسان اگر غور و فکر نہ کرے تو اس کے دیکھنے اور نرگس کی آنکھ میں کوئی فرق نہیں۔اس لئے انسان کو گہرے مشاہدے کی عادت ڈالنی چاہئے۔واقعات اور حادثات کے پیچھے خدا کی مرضی کو سمجھنا چاہئے۔تب اسے سیدھا راستہ مل سکتا ہے۔

**3)شعر:۔ بے قدم دم ہیں خانقاہوں میں         بے عمل علم ہیں مدارس میں**

**حوالہ:۔** یہ شعر حالؔی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** غزل کے اس شعر میں حالؔی کہتے ہیں کہ اب نہ خانقاہوں میں دین کی حقیقی روح رہ گئی ہے نہ ہماری درس گاہوں میں۔یہی وجہ ہے کہ ان مقامات سے با کردار لوگ تربیت پا کر نہیں نکل رہے ہیں۔خانقاہیں اور مدارس انسانوں کی تربیت کے اہم مقامات ہیں۔خانقاہ میں اگر باعمل صوفی ہو اور مدارس میں با کردار اساتذہ تو وہاں سے ایسے لوگ باہر آئیں گے جو اپنے قول و فعل سے دنیا میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔خانقاہ میں دنیا اور صوفی جمع ہو گئے ہیں۔اساتذہ اپنے پیشہ تدریس سے انصاف نہیں کر رہے ہیں۔اس لئے انسانیت کی تربیت کے یہ دو ادارے کمزور ہو گئے ہیں۔

**مرکزی خیال:۔** انسانوں کی جہاں مناسب تربیت ہوتی ہے وہیں بگاڑ‘ سستی اور کاہلی آ جائے تو ترقی رک جاتی ہے۔اس جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

**4)شعر:۔ جانور آدمی فرشتہ خدا         آدمی کی ہیں سینکڑوں قسمیں**

**حوالہ:۔** یہ شعر حالؔی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** غزل کے اس شعر میں حالؔی کہتے ہیں کہ اس دنیا میں آدمی کی صفات اور عادات کے اعتبار سے کئی قسمیں مل جاتی ہیں۔آدمی اگر شیطان کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے لگے تو وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے جانور سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔اور اچھا برا کچھ نہیں دیکھتا بلکہ حیوان صفت ہو جاتا ہے۔آدمی کی اگر اچھی تربیت ہو تو وہ دنیا میں فرشتہ صفت بن کر رہنے لگتا ہے۔وہ سماج میں اچھی مثال بن جاتا ہے۔وہ خود مثالی زندگی گذارتا ہے۔لوگوں کی مدد کرتا ہے۔اور ہمیشہ خیر و بھلائی کی کام کرتا رہتا ہے۔آدمی پر اگر دولت‘ حکومت اور طاقت کا نشہ چھا جائے تو وہ

فرعون کی طرح خدائی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔لیکن بہت جلد اپنے برے انجام کو پہونچ جاتا ہے۔حالؔی اچھے اور برے انسانوں کی اقسام بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کو برائی اور اچھائی میں فرق کرنے چاہئے۔اور اپنے آپ کو اچھے لوگوں کی فہرست میں شامل کرانا چاہئے۔

**مرکزی خیال:۔** خدا نے دنیا میں خیر وشر کا معاملہ رکھا ہے۔انسان کو عقل دی ہے کہ وہ خیر کو اپناتا ہے یا شر کو۔

**5) شعر:۔ کی ہے خلوت پسند حالؔی نے اب نہ دیکھو گے اس کو مجلس میں**

**حوالہ:۔** یہ شعر حالؔی کی غزل سے لیا گیا ہے۔یہ شعر غزل کا مقطع ہے۔

**مرکزی خیال:۔** حالؔی غزل کے مقطع میں کہتے ہیں کہ اب میں نے تنہائی اختیار کر لی ہے اس لئے شاید میں اب مجلسوں میں دکھائی نہ دوں۔یہ تنہائی دنیا کو چھوڑ کر خدا سے لو لگانے کیلئے ہوسکتی ہے۔ضعیفی کے سبب بھی انسان دنیا کے ہنگاموں سے دور ہو جاتا ہے۔حالؔی کا مزاج ہی دینداری کا تھا اس لئے وہ دنیا سے دور رہنے کی بات کرتے ہیں۔

**مرکزی خیال:۔** انسان کو ایک دن یہ دنیا چھوڑنا ہے۔اس لئے اسے اس دنیا میں زیادہ دل نہیں لگانا چاہئے۔اور خدا سے لو لگانا چاہئے۔

سوال: مولانا حالؔی کی شاعری کا عمومی جائزہ لیجئے۔

جواب: **خواجہ الطاف حسین حالؔی** (1837-1914) اُردو کے مشہور شاعر، انشا پرداز سوانح نگار اور نقاد گذرے ہیں۔غالبؔ کے شاگرد تھے اور سرسید کی اصلاحی تحریک میں حصہ لیا، ابتداء میں قدیم طرز کی غزل گوئی کی۔بعد میں ادب کی مقصدیت کے قائل ہوئے انہوں نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں نظمیں سناتے ہوئے نظم گوئی کو فروغ دیا۔مشہور مسدس مدوجزر اسلام 1879ء میں لکھی۔سوانح نگاری میں آپ کی یادگار کتابیں حیات سعدیؒ یادگار غالب 1897 اور حیات جاوید 1901ء مشہور ہیں۔اپنی شاعری کے مجموعہ کو ایک طویل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا جس میں شاعری کے بارے میں اُصولی بحثیں کی گئیں۔بعد میں یہ کتاب ''مقدمہ شعروشاعری'' کے عنوان سے 1893ء میں علٰحدہ شائع ہوئی اور اس کتاب کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ حالؔی ''جدید اُردو تنقید کے بانی'' قرار پائے۔ان کی مثنویاں حب وطن، مناجات بیوہ اور چپ کی داد مشہور ہیں۔حالؔی کا انتقال ۱۹۱۴ء ہوا۔

**حالؔی کی شاعری کی خصوصیات:** مولانا حالی اردو ادب اور شاعری میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔حالؔی سے قبل اردو شاعری میں عام طور پر عشق و عاشقی کے مضامین باندھے جاتے تھے۔زندگی کے حقیقی مسائل کی طرف شعراء بہت کم توجہ دیتے تھے۔جس کی وجہ سے شاعری میں یکسانیت اور یک رنگی کے عناصر پیدا ہوگئے تھے۔عام طور پر شعرا گل وبلبل کی داستانیں بیان کرتے اور سامعین ان عشق ومحبت کے افسانوں سے محضوظ ہوتے جس سے زندگی ایک رخی ہوکر رہ گئی تھی۔عام طور پر صرف غزل، قصیدہ اور مثنوی ہی کا رواج تھا۔مولانا حالؔی نے شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے کی لیکن ان کی غزلیں روایتی نہیں بلکہ ان میں دل سوزی، جذبات کی گرمی اور ندرت تخیل بدرجہ اتم موجود ہے۔مرزا غالبؔ سے انہیں شرف تلمذ حاصل تھا تو انہوں نے شیفتہؔ کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا۔غالبؔ اور شیفتہؔ دونوں اپنے عہد کے مجتہد تھے۔ان دونوں نے شاعری کے باب میں اجتہاد کیا چنانچہ غالبؔ اور شیفتہؔ کی صحبت کی وجہ سے حالؔی کے خیالات میں بھی تغیر آیا اور بعد میں جب مولانا حالؔی لاہور میں قیام پذیر ہوئے تو لاہور کی علمی وادبی صحبتوں نے ان خیالات کو اور جلا بخشی۔لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں مولانا محمد حسین آزادؔ نے 1874ء میں ''انجمن پنجاب'' کے زیر اہتمام ایک نئے طرز کے مشاعرہ کا آغاز کا۔جس میں مصرع طرح کے بجائے موضوعات اور عنوانات طبع آزمائی کیلئے دیئے جانے لگے۔جن پر اکثر شعراء نظمیں کہنے لگے۔مولانا حالؔی نے بھی اس مشاعرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اور اپنی بعض نظمیں جیسے برکھارت، امید وغیرہ سب سے پہلے مولانا حالؔی نے یہیں سنائی تھیں۔اسطرح

اردو شاعری میں ایک نئی جدت پیدا ہوئی اور اس سے اردو شاعری میں جدید اور نت نئے موضوعات اور مضامین مستعمل ہونے لگے۔

مولانا حالؔی جدید اردو شاعری کے معماروں میں ہیں۔ قدرت نے انہیں دردمند اور حساس دل عطا کیا تھا۔ اس دور میں ہمارے ملک کی قومی زندگی بے شمار مسائل سے دوچار تھی۔ عوام انگریزی استبداد کے زیر اثر ظلم وستم کا شکار تھے۔ مولانا حالی نے ان قومی مسائل سے اثر قبول کیا اور جہاں تک ہوسکا ان حالات کے خلاف اپنی شاعری کے ذریعہ آواز اٹھائی اور دوسرے شعراء کو بھی آواز اٹھانے کی کامیاب ترغیب دی۔ ان کی شاعری کا لب ولہجہ انتہائی دردمند اور سوز گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔ حالؔی کی اکثر غزلوں میں انسانی ہمدردی خلوص اور محبت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ شاعری میں جو الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ نرم و نازک ہوتے ہیں۔ اس کے انداز بیان میں بھی دردمندی اور انسانیت کا درد وغم جھلکتا ہے۔ ان کی غزلوں میں تصنع اور بناوٹ نہیں۔

مولانا حالؔی نے اردو شاعری کو صنائع بدائع، رعایت لفظی اور تکلف اور بناوٹ سے پاک کیا اور صفائی، سادگی وسلاست اور بلند خیالات سے بھرپور نظمیں خود بھی لکھیں اور اپنے ہم عصروں کو بھی اس جانب راغب کیا۔ اور آنے والی نسل کے شعراء کیلئے ایک لائحہ عمل دیا اور یہی چیز ان کو اردو شعاری میں ایک بلند مقام ومرتبہ پر فائز کرتی ہے۔ ان کی نظموں میں سادگی، روانی، تسلسل، ہمواری، یکسانیت اور یک رنگی موجود ہے۔ لیکن ان کے مجموعے کلام کو ایک ضخیم اور طولانی وعظ کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا۔ ان کے کلام میں درس عمل، واقفیت اور وجدانی کیفیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی غزلیں پڑھ کر قاری بھی ویسے ہی جذبات اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔

# غزل 1 از: مخدومؔ محی الدین

**سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔**

**1) شعر:۔ آپ کی یاد آتی رہی رات بھر چشم نم مسکراتی رہی رات بھر**

**حوالہ:۔** یہ شعر مخدومؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ شعر غزل کا مطلع ہے۔

**تشریح:۔** شاعر مخدومؔ غزل کے مطلع میں کہتے ہیں کہ اے خدا میں تیرے عشق میں مبتلا ہوں۔ تجھ سے ملنا چاہتا ہوں۔ تیرا دیدار کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس زندگی میں یہ نعمت ملنا ناممکن لگتا ہے۔ تیرے عشق کے سبب میں غم میں ڈوب گیا ہوں۔ یہ غم دن میں تو سکی طرح کم رہتا ہے۔ جبکہ دنیا کے ہنگامے جاری رہتے ہیں۔ لیکن رات میں جب کہ ساری دنیا سوتی رہتی ہے۔ تیری یاد اور تیرا غم مجھے ستاتا رہتا ہے اور تیری یاد میں میں ساری رات روتے رہتا ہوں۔ اور رونے کے سبب میری بھیگی آنکھیں تجھ سے ملنے کی امید میں مسکراتی رہتی ہیں۔ انسان کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے اسے پانے کی آرزو رکھتا ہے۔ اور اگر وہ نہ ملے تو اس کی یاد میں غمگین رہ کر رونے لگتا ہے۔ رونے کی یہ کیفیت رات میں زیادہ رہتی ہے۔ رونے سے انسان کا غلم ہلکا ہوتا ہے۔ اس شعر میں ایک سچے عاشق کا حال بیان کیا گیا ہے۔

**مرکزی خیال:۔** محبوب سے دوری کے سبب عاشق غم میں مبتلا رہتا ہے۔ اور اسی غم کے سبب وہ رات بھر روتا رہتا ہے۔

**2) شعر:۔ رات بھر درد کی شمع جلتی رہی غم کی لو تھرتھراتی رہی رات بھر**

**حوالہ:۔** یہ شعر مخدومؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** غزل کے اس شعر میں مخدومؔ عشق کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا کے عشق میں ڈوبا ایک سچا عاشق ایک شمع کی طرح رات بھر درد وغم میں تڑپتا اور جلتا رہتا ہے۔ شاعر غم کو شمع کی لو سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جس طرح شمع کی لو جلتے ہوئے تھرتھراتی ہے۔ اسی طرح وہ بھی غم عشق میں ڈوب کر جلتا رہتا ہے۔ عشق حقیقی میں بندہ خدا کی یاد میں اور اس کے دیدار کیلئے تڑپتا رہتا ہے۔ اسے یہ دنیا قید خانہ لگتی ہے۔ وہ جلد سے جلد زندگی کی قید سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ زندگی کا ایک ایک پل بھاری سمجھ کر خدا کی یاد میں روتا ہوا گزارتا ہے۔ یہ معاملہ عاشق بندے اور معشوق خدا کے درمیان رہتا ہے۔ اور اکثر دنیا والے اس کیفیت سے ناواقف رہتے ہیں۔

**مرکزی خیال:۔** شاعر خدا کی یاد میں رو رو کر رات گزارتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو شمع سے تشبیہ دیتا ہے۔ جو آہستہ آہستہ رات بھر جلتی ہے اور صبح میں بجھ جاتی ہے۔ دنیا والے جب رات میں سو جاتے ہیں تو شاعر رات بھر رو کر خدا کو یاد کرتا رہتا ہے۔

**3) شعر:۔ بانسری کی سریلی سہانی صدا یاد بن بن کے آتی رہی رات بھر**

**حوالہ:۔** یہ شعر مخدومؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** غزل کے اس شعر میں مخدومؔ کے اپنے شاندار ماضی کو یاد کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اب اس کی زندگی مشکلوں اور پریشانیوں میں گذر رہی ہے۔ جب کہ اس کا ماضی شاندار خوشحال تھا۔ چنانچہ غم کے ان دنوں میں وہ اپنے گذرے ہوئے زمانے کو یاد کرتا ہے۔ اور ماضی کی خوشگوار یادوں کے سہارے اپنا غم بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ اپنے حال سے کبھی خوش نہیں رہتا۔ اور اس کا ماضی کیسا ہی کیوں نہ ہو وہ اپنے ماضی کی یادوں کو بھلانا نہیں چاہتا اور انہیں ایک متاع عزیز سمجھ کر ان سے دل بہلاتا رہتا ہے۔ جب انسان کا کوئی ساتھی اور مددگار نہیں رہتا ہے تو وہ اپنی یادوں کو ہی اپنا دوست بنالیتا ہے۔

مرکزی خیال:۔ انسان غم کے موقع پر اپنا غم بانٹنے کیلئے کسی رفیق کی تلاش میں رہتا ہے۔ جب کوئی اس کا غم بانٹنے تیار نہیں رہتا تو وہ اپنے ماضی کی یادوں کو اپنا رفیق بنالیتا ہے۔ اور انہیں یاد کرتے ہوئے غم کے وقت دل بہلاتا رہتا ہے۔

**4) شعر:۔ یاد کے چاند دل میں اترتے رہے چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر**

**حوالہ:۔** یہ شعر مخدومؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** غزل کے اس شعر میں مخدومؔ اپنے ماضی کی یادوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اس کی یادیں چاند بن کر دل میں اُتر رہی ہیں۔ ہر انسان کے ساتھ کی یادوں کا سرمایہ ہوتا ہے۔ یہ وہ دولت ہے جو سب کو عزیز رہتی ہے۔ شاعر غم کے وقت یادوں کی روشنی سے اپنے دل کی اندھیری دنیا کو روشن کرتا رہتا ہے۔ انسان کی عادت ہوتی ہے کہ وہ غم کے وقت کسی کا ساتھ چاہتا ہے۔ جب دنیا والے اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو وہ اپنے ماضی کی خوشگوار یادوں کو اپنا رفیق بنالیتا ہے۔ اور انہیں یاد کرتے ہوئے اپنا دل بہلاتا رہتا ہے۔

**مرکزی خیال:۔** انسان کی یادیں ہی اس کی بہتر رفیق ہوتی ہیں۔ جن کے سہارے وہ غم کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔

**5) شعر:۔ کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا کوئی آواز آتی رہی رات بھر**

**حوالہ:۔** یہ شعر مخدومؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ شعر غزل کا مقطع ہے۔

**تشریح:۔** شاعر مخدومؔ غزل کے مقطع میں کہتے ہیں کہ عشق کا مارا کوئی دیوانہ گھر سے باہر نکل گیا ہے۔ اور وہ گلیوں میں آوازیں لگاتا ہوا مارا مارا پھر

رہا ہے۔عشق کی شدت کے سبب انسان کے ہوش وحواس بھی چلے جاتے ہیں۔اسے ایک جگہ بیٹھنا نصیب نہیں رہتا۔وہ عجیب وغریب آوازیں نکالتا پھرتا رہتا ہے۔اس کی آوازیں وہی سمجھ سکتے ہیں جو عشق سے دوچار ہوئے ہیں۔جب تک عشق میں دیوانگی نہیں آتی۔تب تک اس میں کمال پیدا نہیں ہوتا۔اللہ والے لوگ خدا کے عشق میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ ان پر جذب کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔اور وہ اللہ اللہ کہنے لگتے ہیں۔شاعر اسی کیفیت والے لوگوں کی طرف اشارہ کررہا ہے۔

**مرکزی خیال:۔** عشق میں شدت انسان کو دنیا سے بے خبر کردیتی ہے۔اور انسان خدا کی یاد میں آوازیں لگاتا ہوا دیوانہ وار رات دن پھرنے لگتا ہے۔یہ کیفیت پیدا کرنے کیلئے بڑی ریاضت اور قربانی کی ضرورت پڑتی ہے۔

# غزل2 از: مخدومؔ محی الدین

**سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔**

**1)شعر:۔ زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی زندگی رنگ وگل کا بیاں دوستو گاہ روتی ہوئی گاہ ہنستی ہوئی میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو**

**حوالہ:۔** یہ شعر مخدومؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔یہ شعر غزل کا مطلع ہے۔

**تشریح:۔** غزل کے مطلع میں شاعر مخدومؔ زندگی کے مختلف رنگ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی میں جب خوشیاں ہوتی ہیں تو وہ ایک موتی کی لڑی ہوجاتی ہے۔جب کے سلسلہ وار کسی کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں آتی جاتی ہیں۔اور زندگی میں خوشی کے رنگ چھاجاتے ہیں۔انسان کے دن عید اور رات شب برات کی طرح خوشی کے نغمے گاتے ہوئے گذرنے لگتے ہیں۔لیکن جب مسلسل خوشیاں ہوں تو خوشی کی اہمیت کم ہوجاتی ہے۔اور یہ فطرت کا قانون ہے کہ ہر خوشی کے بعد غم لازمی ہے۔اس لئے انسان کی زندگی میں غم بھی آتے ہیں غم کے بعد پھر آنے والی خوشی کا مزہ دوبالا ہوجاتا ہے۔انسان کی زندگی میں خوشی ہو یا غم اس کا اندازہ اس کی آنکھوں سے جھلکنے والی خوشی اور غم کی کیفیت سے لگایا جاسکتا ہے۔خوشی اور غم خدا کی طرف سے آتے ہیں انسان کی خوشی کے موقع پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔اور اپنے پاس موجود نعمتوں کو دوسروں میں بانٹنا چاہئے۔اور غم کے وقت صبر کرتے ہوئے خدا سے دعا گو رہنا چاہئے۔

مرکزی خیال:۔خوشی اور غم انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔خوشی میں زندگی میں رنگ چھاجاتے ہیں۔اور غم کے موقع پر مایوسی کا عالم رہتا ہے۔خوشی کے موقع پر شکر اور غم کے موقع پر صبر اختیار کرنا چاہئے۔

**2)شعر:۔ کیسے طے ہوگی یہ منزل شام غم کس طرح سے ہو دل کی کہانی رقم**

اک ہتھیلی میں دل اک ہتھیلی میں جاں اب کہاں کا یہ سوز وزیاں دوستو

**حوالہ:۔** یہ شعر مخدومؔ کی غزل سے لیا گیا ہے۔

**تشریح:۔** غزل کے اس شعر میں شاعر مخدومؔ کہتے ہیں کہ عشق کے سبب ان کی زندگی میں غم چھا گیا ہے۔زندگی کا سفر کٹھن ہوگیا ہے۔غم میں دن تو کسی طرح کٹ ہی جاتا ہے لیکن غم کی راتیں کاٹے نہیں کٹتیں۔میرے غمزہ دل کی کہانی کون سنے گا کون لکھے گا۔اب تو دل وجاں ہتھیلی میں لئے پھر رہا ہوں۔اب نہ غم کا اندازہ ہے نہ نقصان کا۔شاعر کو احساس ہے کہ غموں میں ڈوبی زندگی کے اس سفر کا اختتام کب اور کیسے ہوگا۔

**مرکزی خیال:۔** زندگی میں اگر غم ہوں تو زندگی کی سفر کٹھن اور مشکل ہوجاتا ہے۔شاعر کو اپنی زندگی اہم نہیں لگتی۔اور وہ کسی طرح زندگی کی قید

سے آزاد ہو جانا چاہیئے۔

**سوال: مخدوم کی شاعری پر نوٹ لکھو؟**

**جواب:** مخدوم محی الدین اردو زبان کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بائیں بازو کے نامور رہنما بھی تھے۔ مخدوم 4 فروری 1908ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک کٹر مذہبی خانوادے سے تھا۔ ان کے دادا حیدرآباد دکن کی تاریخی مکّہ مسجد میں قاری تھے۔ والد غوث محی الدین بھی مذہبی ادارے سے وابستہ تھے اور ان کی رہائش بھی مسجد ہی میں تھی۔ پیدائشی طور پر ان کا گھرانہ بے حد غریب تھا، اپنے آس پاس غربت اور استحصال کا دور دورہ دیکھ کر وہ بائیں بازو کے نظریات سے متاثر ہو گئے اور زندگی بھر جدوجہد میں رہے۔ مخدوم خالصتاً مزدور طبقہ کے شاعر اور ہمنوا تھے۔ عملی سیاست میں آنے کے بعد بھی انہوں نے اہل اقتدار سے لے کر رکشہ والے تک، ہر کسی سے تعلق رکھا۔ انہوں نے حیدرآباد دکن میں جاگیرداری نظام کے خلاف لڑتے ہوئے وہاں کے عام کسانوں کی قیادت کی اور باقاعدہ مسلح جدوجہد کی۔ 25 اگست 1969ء کو جب وہ حیدرآباد سے ایک میٹنگ میں شرکت کرنے دہلی آئے ہوئے تھے، ان کا انتقال ہو گیا۔ انہیں حیدرآباد دکن میں قبرستان شاہ خموش میں دفن کیا گیا۔ ان کے لوح مزار پر یہ شعر کندہ ہے؛

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا  سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

**شعری سفر:** ان کا شعری سفر 35 سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ مخدوم ایک زود گو شاعر نہیں تھے۔ تاہم مختلف وقفوں سے ان کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے۔ سرخ سویرا، گل تر اور بساط رقص۔ مخدوم نے زیادہ تر نظم کی صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزلوں کی کل تعداد محض 21 ہے۔ ''آپ کی یاد آتی رہی رات بھر'' اور ''عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات ڈھلے'' ان کی نمائندہ غزلوں میں سے ہیں۔ نظم میں بلور، ملاقات، عورت، وقت، بے درد مسیحا اور خواہش چند مقبول نام ہیں۔

**مخدوم محی الدین کی شاعری کی خصوصیات:**

رات بھر دیدہ نمناک میں لہراتے رہے  سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

یہ حروف کسی خیال کا عکس نہیں بلکہ زندگی کی پوشیدہ سچائی ہیں۔ ان رشتوں کی عبادت ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہوتا لیکن پھر بھی ہم ان کی یاد میں، آہوں کی تسبیح پڑھتے رہتے ہیں۔ زندگی کی معنویت کو سمجھنے کے لیے مخدوم محی الدین جیسے شاعر ہی مددگار ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ زندگی کی رومانویت کے عاشق ہوتے ہیں۔ مخدوم محی الدین دنیا سے پردہ کر گئے مگر انہوں نے زندگی کے چہرے کو بے نقاب کیا۔ دل کی دنیا بیان کی۔ روح کے زخموں پر مرہم رکھا۔ محبوب کی دوری کو لفظوں سے قریب کیا۔ خواب کے راستے پر جانے والے کو حوصلہ عطا کیا۔ اسی لیے وہ کبھی اپنے لفظوں میں نمودار ہو جاتے ہیں تو کبھی مجسم محبتوں کے احساسات کو سانس کی طرح محسوس کرتے ہیں، ایسی زندہ محبت کے احساس کو لکھنا، صرف مخدوم کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ مخدوم محی الدین کی زندگی اور ترقی پسند تحریک کی جدوجہد سے تو زمانہ واقف ہے مگر ان کی شاعری کے طلسم سے اور کیا کچھ ہوا، اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ مخدوم محی الدین کی شاعری جہاں ترقی پسند تحریک کے جھنڈے میں رنگ بھرتی رہی، وہیں زخمی روحوں کے گھاؤ بھرنے میں بھی ان کے لفظ کام آتے رہے۔ مخدوم کے باہر کا آدمی، آدمیت کے حقوق کے لیے لڑتا رہا۔ مخدوم کے اندر کے آدمی نے اضطراب اور بے چینی کی مزدوری کی۔ کہیں وہ چشم نم پر مسکراتا رہا، کہیں کسی کی یاد بانسری کی سریلی صدا بن کے اس کی ساعتوں کو مسحور کرتی رہی اور کہیں وہ اپنے آپ سے نکل کر، اُس کی تلاش میں خود کی نفی کر بیٹھا۔ یہ دیوانگی عمر بھر مخدوم محی الدین کو بسر کرتی رہی۔ وہ اپنے وجود کو، لفظوں کے ذریعے جوڑنے کی سعی

کرتا رہا۔۔۔۔۔۔

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر　　چشمِ نم مسکراتی رہی رات بھر
یاد کے چاند دل میں اترتے رہے　　چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر
کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا　　کوئی آواز آتی رہی رات بھر

مخدوم محی الدین کی شاعری میں دو پہلوؤں نے ان کو رومانوی قبیلے کے شعرا میں شامل کر دیا۔ان کے ہاں لفظ کا انتخاب اور استعارے کا کینوس بہت وسیع ہے جس کی وجہ سے لفظ کی معنویت دیرپا اور گہری ہو جاتی ہے۔ان کے موضوعات،لفظوں کا انتخاب، سلیس زبان کی گواہی دیتے ہیں۔انتظار، شاعر، جنگ، قید، اندھیرا، چارہ گر، مشکل باتوں کو آسانی سے سمجھا دیتے ہیں۔مخدوم نے زندگی کو بھی لفظوں کی طرح تراش کر گزارا، کٹھن راستے پر بہت سہولت سے چلتے رہے، خیال کی بلندی کو چھولیا اور رومانویت کو زندگی کے ماتھے کا ٹیکہ بنا دیا۔مخدوم محی الدین کے نظموں کے مجموعہ ''بساطِ رقص'' نے نظم کی روانی اور شاعری میں استعارے کے بہترین استعمال سے مداحوں کے دل میں جگہ بنالی لیکن انہوں نے غزل میں بھی اپنا لوہا منوایا۔اپنے مخصوص لب ولہجہ میں لفظوں کی بُنت کرتے رہے۔بہت کم شاعر ایسے ہوتے ہیں جن کے ہاں شدت بھیتو ازن میں ہے ،جب انقلاب کا نعرہ لگاتے ہیں تو شاعری گہرے رنگوں سے لبریز ہوتی ہے مگر جیسے ہی رومان کا تذکرہ نکلتا ہے، ان کی شاعری دھنک اور مدھم رنگوں کا آمیزہ بن جاتی ہے۔اس قدر خوبصورت اداسی کسی اور شاعر کے کلام میں سنائی نہیں دیتی۔یہ کمال بھی مخدوم محی الدین کا ہے کہ ان کے لکھے ہوئے لفظ زندہ وجاوید ہوتے ہیں، وہ خاموش ہو کر بھی بات کر رہے ہوتے ہیں۔منظر کشی سے جذبے کی جہت کو بیان کر رہے ہوتے ہیں، ایسے طلسماتی لفظ کو پڑھ کو کون اپنا دل نہیں پکڑے گا؟ یہ وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو مختلف موسیقاروں کے دھنوں میں روح بن کے اترتی رہی۔مہیش بھٹ کی فلم ''تمنا'' میں یہ غزل شامل ہوئی۔انتظار کی کیفیت کو کیا خوب بیان ہے کہ۔۔۔۔۔۔

شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی　　آپ کے آنے کی اِک آس تھی اب جانے لگی
صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی
میرے محبوب میری نیند اڑانے والے　　میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے
آ بھی جاتا کہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے　　آ بھی جاتا کہ ترے قدموں میں مری جاں نکلے

نئی نسل محبت کو کسی اور طرح برتتی ہے مگر دراصل محبت حقیقت میں جو ہے، اس کو مخدوم محی الدین کی شاعری ہی سمجھا سکتی ہے۔فیض احمد فیض نے مخدوم کی غزل ''آپ کی یاد آتی رہی رات بھر'' کی زمین پر غزل لکھی اور پہلا مصرعہ بھی مستعار لیا۔یہ فیض احمد فیض کا مخدوم کے لیے اعتراف ہے کہ وہ شاعری کے آسمان پر درخشاں ستارے تھے۔مخدوم نے اپنی نظم ''اندھیرا'' یوں لکھی کہ زندگی کی تاریکیوں اور تلخ حقائق کو بیان کر دیا۔کوئی بات بھی مشکل نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی اتنا ناسمجھ ہوتا ہے۔کوئی کچھ کہے اور وہ سمجھ نہ سکے مگر کہنے کا انداز اور سمجھانے کا طریقہ ہی تخلیق کی بنیاد ہوتی ہے۔فطرت سے بھرپور اور رومان کے رنگوں میں ڈوب کر بہت سے لوگوں نے شاعری کی مگر کسی کی شاعری سمجھی نہیں گئی، کوئی اپنے احساسات سمجھا نہیں سکا مگر مخدوم کے ہاں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ لفظ لکھتا جاتا ہے اور پڑھنے والا سمجھتا جاتا ہے۔اس قدر سہل انداز بیاں ہمیں بتاتا ہے کہ مخدوم کی تخلیقی نسبت کا سلسلہ کہیں نہ کہیں سے ہو کر میر کے سلسلے سے جا ملتی ہے۔مخدوم کی شاعری میں احتجاج یا انقلاب کی بات ہو یا پھر رومان کی کہانی اور کیفیت ہو۔یہ سب لکھا اُس نے عوام کے لیے ہے۔ان کی شاعری میں عوام کے خوابوں کی کرچیاں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔رومان زندگی

کا یا ذات کا، مخدوم کے قلم سے نکلے ہوئے لفظ اسی کی گواہی دیتے ہیں۔

دوسرا کوئی نہیں رہتا جہاں رہتا ہوں میں اپنیسیلابِ خودی میں آپ ہی بہتا ہوں میں

مخدوم محی الدین نے ترقی پسند تحریک کی جدوجہد میں شانہ بشانہ حصہ لیا۔ شاعری کے ذریعے تحریک کی آواز کو دور تک پہنچایا اور آواز میں زور کی بجائے لفظ میں زور ہو تو آواز بہت دور تک جاتی ہے۔ مخدوم کی لفظیات میں دم تھا، اسی لیے سارے جہان میں، ان کے لکھے ہوئے الفاظ سنے گئے اور دلوں میں بھی اتر گئے۔ انہوں نے نثر نگاری بھی کی، کئی تراجم کیے اور ڈراما نگاری بھی کی۔ مخدوم محی الدین نے سوویت یونین کی بالشیویک پارٹی کی ''تاریخ'' نامی کتاب کے جدلیاتی باب کا ترجمہ کیا اور دیگر کئی تراجم کیے۔ اس کے علاوہ نثری تحریروں میں، ٹیگور کا پیام، پھول اور پتھر، کھوئے ہوئے تارے، یورپ کا لکھنو و یانا، اپنا کھانا اپنا گانا، راحتِ جاں، عید اور خودکشی، قلم، اجنبی، چاندنی چوک کا ایک کھڑا مشاعرہ، بگھی کے پیچھے چھوکرا، مجاہد اقبال، ادب کا مقصد جیسی تحریریں شامل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں مضمون نویسی، افسانہ نویسی، رپورتاژ، تنقید نگاری کی بھی مکمل صلاحیتیں موجود تھیں، جو اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ زندگی کی کہانی لکھنے کے لیے تحریروں کو جس انداز میں بھی ڈھالنا پڑا، انہوں نے اپنے قلم کا رُخ اسی جہت کی طرف کر دیا۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مخدوم محی الدین نہ صرف انقلابیا و رومانوی شاعری بلکہ نثر نگاری میں بھی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

عہد گزشتہ میں لوگ برے وقت کی چکی میں پسا کرتے تھے، لمحہ موجود میں، مہنگائی، بناوٹ اور بے حسی کے چکر نے جذبوں کو پیس دیا ہے۔ شہروں میں آبادی بڑھتی جا رہی ہے مگر شاعر، ادیب اور اہلِ دل کم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ لوگ کسی بھی معاشرے کی آنکھیں ہوتے ہیں اور اب معاشرہ اندھا ہو رہا ہے، صرف مالی فوائد اور مادی خواہشات نے عہدِ جدید کی بینائی چھین لی ہے۔ آج کا انسان فطرت سے بھی دور ہو گیا ہے۔ یہی حالات مخدوم کے زمانے میں بھی ہوں گے مگر اس نے پھر کس قدر فطری رویوں کی عکاسی کی اور احساسات کو قلم بند کیا۔ کتنے ہی ایسے دن ہوں گے، جب چودھویں کا چاند آسمان پر اپنی پوری آب و تاب سے چمکتا ہے لیکن زمین پر رہنے والے مادی دور کے مصروف لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں کہ کبھی نظر اٹھا کر فلک پر چمکتے چاند کو دیکھ لیں، جس کی روشنی رومان کے رنگ میں نہائی ہوئی ہے مگر مخدوم کی نظر آسمان پر بھی تھی جب ہی چاند کو استعارہ بنایا۔

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

مخدوم نے معاشرے کی جنگ میں ترقی پسند تحریک کے ذریعے عملی طور پر حصہ لیا مگر اس عرصے میں وہ انسان کے اندر برپا جنگ کو نہیں بھولا۔ اسی لیے کیفیات سے مزین شاعری پڑھنے والوں کو مسحور کرتی رہی۔ مخدوم کے رومان میں اداسی ہے، جیسے کسی مکان کو خالی کر کے جانے والے کی یاد میں دیواریں راستے کا منہ تکتی ہوں، دروازہ ان کی یاد کو سینے سے لگائے اپنے مکینوں کی سرگوشیوں کو سن رہا ہو۔ مخدوم نے صرف انسان کا ہی نہیں بلکہ چیزوں کا دکھ بھی محسوس کیا۔ جن مکانوں سے پرانے رہنے والے چلے گئے، ان کے در و دیوار کی نگاہ کو اور دروازوں کے دکھ کو بھی محسوس کیا۔ آج مخدوم محی الدین کے لفظ ہم سے بات کرتے ہیں، ہم ان لفظوں کے آئینے میں اپنے بچھڑے ہوئے مکینوں کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمارا دل مخدوم کی شاعری میں اُسی دروازے کی طرح یادوں کو سینے سے لگائے جانے والوں کی سرگوشیاں سننے کیلیے ہمہ تن گوش ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جمیل نظام آبادی

تعارف: محمد عبدالباری نام اور جمیلؔ تخلص ہے۔ اپنے شہر نظام آباد کی مناست سے جمیلؔ نظام آبادی قلمی نام اختیار کیا۔ اور اسی نام سے شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ یکم جنوری 1949ء کو نظام آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام جناب شیخ احمد ہے۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد روزگار کی تلاش میں لگ گئے۔ لیکن تعلیم کے حصول کا سلسلہ جاری رکھا۔ میسور یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ 1973ء سے ایک اردو ہفتہ وار اخبار گونج کے نام سے جاری کیا۔ جو آگے چل کر ایک ادبی ماہنامے میں تبدیل ہوگیا۔ 1980ء سے ریاستی اردو اکیڈیمی کے ریجنل آفس نظام آباد پر مینجر کی حیثیت سے کارگذار ہیں۔ 1970ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ غزل محبوب صنف سخن ہے۔ نظمیں ثلاثیاں، حمد اور نعت بھی کہی ہیں۔ جمیلؔ نظام آبادی کا پہلا شعری مجموعہ ''سلگتے خواب'' کے عنوان سے 1978ء میں شائع ہوا۔ پھر'' تجدید آرزو 1985ء۔ صبر جمیل 1993ء۔ دل کی زمین 2004ء اور'' سب سخن میرے 2010ء میں شائع ہوکر مقبول ہوئے۔ 2007ء میں نثری مضامین کا مجموعہ'' حرف جمیل'' کے نام سے شائع ہوا۔ جمیلؔ نظام آبادی ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کے افسانے اور غزلیں ملک اور بیرون ملک رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ ان کی تین کتابوں کو اردو اکیڈیمی اے پی نے انعامات سینوازا۔ دکن کے 155 شعراء اور قلمکاروں کی تصاویر اور تعارف پر مبنی'' گونج ادبی البم'' کے نام سے شائع کیا۔ جسے ایک دستاویزی اہمیت حاصل ہے۔ ایک اور مجموعہ کلام'' شہر سخن'' کے نام سے زیر طباعت ہے۔

جمیلؔ نظام آبادی کی شاعری قدیم اور جدید شعری روایات کی علمبردار ہے۔ انہوں نے غزل کے روایتی موضوعات کے ساتھ دور جدید کے مسائل پر بھی اشارے کئے ہیں۔ چھوٹی اور بڑی بحروں میں روانی کے ساتھ انہوں نے خیالات کو پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری اپنے دور کی ترجمان ہے۔

## غزل 1 از: جمیلؔ نظام آبادی

تجھ سے جب پڑ ہی گیا ہے واسطہ ائے زندگی
میں تجھے بننے نہ دوں گا مسئلہ ائے زندگی

تو نے میرے ہاتھ میں پتھر تھمایا تھا مگر
میں نے اس کو کردیا ہے آئینہ ائے زندگی

کون روکے گا مجھے بڑھنے سے منزل کی طرف
میرے قدموں میں پڑا ہے راستہ ائے زندگی

تو بھی چپ ہے میں بھی چپ ہوں کون پاٹے گا بھلا
اب ہمارے درمیاں کا فاصلہ ائے زندگی

ایک دن تو چھوڑ جائے گی اکیلا راہ میں
ایک دن تو بن جائے گی سانحہ ائے زندگی

تیرے ملنے سے جمیلؔ خستہ جاں کیوں خوش رہے

جانتا ہوں جب کہ تو ہے بے وفا ائے زندگی

**سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔**

**شعر: تجھ سے جب پڑ ہی گیا ہے واسطہ ائے زندگی**
**میں تجھے بننے نہ دوں گا مسئلہ ائے زندگی**

حوالہ: یہ شعر جمیلؔ نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مطلع ہے۔

تشریح: غزل کے مطلع میں شاعر زندگی کو بہتر گذارنے اپنے عزم کا اظہار کرتے ہیں۔ جمیلؔ نظام آبادی کہتے ہیں کہ شاعر کو زندگی کی اہمیت کا احساس ہے اور اس کی تجربہ کار نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ دنیا میں انسان کے لئے چاروں طرف مسائل ہیں۔ اس لئے وہ زندگی کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کرتا ہے اور اس بات کے عزم کا اظہار کرتا ہے کہ زندگی کو مسائل سے دوچار ہونے نہیں دے گا۔ اور آنے والے ہر مسئلے کا حل نکالے گا۔

مرکزی خیال: شاعر اپنی زندگی کے بارے میں پرعزم ہے۔ اور وہ لوگوں کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ بھی زندگی کو مسائل سے دوچار نہ کرلیں اور اگر مسائل سامنے آئیں تو انہیں ہمت اور حوصلے سے حل کرنے کی جستجو کریں۔

شعر:

تو نے میرے ہاتھ میں پتھر تھمایا تھا مگر
میں نے اس کو کردیا ہے آئینہ ائے زندگی

حوالہ: یہ شعر جمیلؔ نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: غزل کے اس شعر میں شاعر زندگی کو خوشگوار بنانے اپنی کوششوں کا ذکر کرتا ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ زندگی میں اس کے سامنے بے شمار مسائل آئے تھے۔ اور یہ راستے میں رکاوٹ بننے والے پتھر کی طرح اسے پریشان کررہے تھے۔ لیکن شاعر نے اپنے عزم وحوصلے مسلسل محنت اور لگن سے مسائل کو حل کرنا سیکھ لیا اور اس کی زندگی اب مثال آئینہ مسائل سے پاک صاف ستھری ہے۔ اس طرح شاعر مسائل سے دوچار لوگوں کو حوصلہ دلا رہا ہے کہ وہ بھی مسائل کا سامنا کرنا سیکھیں اور اپنی زندگی کو خوشگوار بنائیں۔

مرکزی خیال: زندگی میں مسائل آتے ہیں لیکن کامیاب انسان وہی ہے جو مسائل کا ہمت سے سامنا کرے اور ان کا حل نکالتے ہوئے اپنی زندگی کو خوشگوار اور مثالی بنائے۔

شعر:

کون روکے گا مجھے بڑھنے سے منزل کی طرف
میرے قدموں میں پڑا ہے راستہ ائے زندگی

حوالہ: یہ شعر جمیلؔ نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: غزل کے اس شعر میں شاعر زندگی کے سفر میں آگے بڑھنے اور منزل کو پانے کے عزم کا ذکر کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے زندگی کا راستہ پالیا ہے۔ اب مجھے چھوٹے بڑے مسائل زندگی کی راہ میں آگے بڑھنے اور کامیابی کی منزل پانے سے نہیں روک سکتے۔ میرا حوصلہ بلند ہے اور

میں زندگی کی راہ میں پیش آنے والی ہر رکاوٹ کو پار کر سکتا ہوں اور اپنی منزل مقصود کو پا سکتا ہوں۔انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے راستے میں آگے بڑھتے ہی جائے تو اسے مسائل کا حل بھی ملے گا اور منزل بھی ملے گی۔

مرکزی خیال: زندگی کی کٹھن راہوں پر ثابت قدم چلنے والوں کو ہی منزل ملتی ہے اور وہی اس دنیا میں کامیاب رہ سکتے ہیں۔

شعر:

تو بھی چپ ہے میں بھی چپ ہوں کون پاٹے گا بھلا
اب ہمارے درمیاں کا فاصلہ اے زندگی

حوالہ: یہ شعر جمیلؔ نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: غزل کے اس شعر میں شاعر کی زندگی سے شکایت کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ انسان زندگی کی قید میں آ گیا ہے۔اور اسچاروں طرف مسائل ہی نظر آ رہے ہیں ان کا حل دکھائی نہیں دے رہا ہے۔زندگی بھی خاموش تماشائی بنی دیکھ رہی ہے اور انسان کی خوشی اور غم کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ایسے میں شاعر امید کرتا ہے کہ اس کے مسائل دور ہوں اور وہ بھی اپنی زندگی خوشحال گذارے لیکن ایسا ممکن دکھائی نہیں دیتا۔اس لئے شاعر زندگی سے شکوہ کر رہا ہے کہ وہ اس سے کیوں روٹھ گئی ہے۔

مرکزی خیال: شاعر زندگی کے دکھ درد سہتے سہتے صبر کر رہا ہے اور اس امید میں ہے کہ زندگی اس پر مہربان ہوگی اور اس کی خوشیاں لوٹ آئیں گی۔لیکن یہ کب ہوگا شاعر کو اس کا انتظار ہے۔

شعر:

ایک دن تو چھوڑ جائے گی اکیلا راہ میں
ایک دن تو بن جائے گی سانحہ اے زندگی

حوالہ: یہ شعر جمیلؔ نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: غزل کے اس شعر میں شاعر انسان کے انجام کی طرف ذکر کر رہا ہے۔جمیلؔ کہتے ہیں کہ زندگی کسی کے لئے خوشی لاتی ہے تو کسی کے لئے غم۔انسان اپنے سفر زندگی میں لوگوں کا ساتھ چاہتا ہے۔اچھی قسمت کی تمنا کرتا ہے۔لیکن کبھی کبھی انسان کے ساتھ قسمت اور زندگی وفا نہیں کرتے اور اسے اس حال میں چھوڑ دیتے ہیں جہاں انسان کی زندگی ایک حادثے سے کم نہیں لگتی۔شاعر انسان کے اسی انجام کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔اور زندگی سے شکایت کر رہا ہے کہ وہ اس کے لئے حادثہ نہ بن جائے۔

مرکزی خیال: شاعر کو اس بات کا ڈر ہے کہ زندگی اسے تنہا چھوڑ دے گی اور وہ مسائل سے دوچار ہو کر حادثات کا شکار ہو جائے گا۔اپنے اس ڈر کا اظہار کرتے ہوئے شاعر یہ تمنا کرتا ہے کہ اس کی زندگی میں ایسے حادثات نہ ہوں جن سے اسے پریشانی ہو۔

## غزل 2 از: جمیلؔ نظام آبادی

**سوال: ذیل کے اشعار کی حوالے کے ساتھ تشریح کیجئے۔**

پھوٹے تیرے بھاگ پرندے

جنگل جنگل آگ پرندے
بال و پر کترے گی دنیا
بھاگ یہاں سے بھاگ پرندے
سورج کا عفریت ہے اوپر
اور زمیں پر ناگ پرندے
رستوں پر بارود بچھی ہے
گلیوں گلیوں آگ پرندے
دور کہیں پھر اُڑ جانا
آئے نظر جو آگ پرندے
اُس کا دشمن ایک زمانہ
جو بولے بے لاگ پرندے
شائد میری بات لگی ہے
بے موسم کا راگ پرندے
سستی شہرت جھوٹی مایا
ہے صابن کا جھاگ پرندے
بات میری یہ دھیان میں رکھنا
یہ دنیا ہے گھاگ پرندے
ورنہ پھر پچھتائے گا تو
نیند سے اب تو جاگ پرندے

شعر: پھوٹے تیرے بھاگ پرندے جنگل جنگل آگ پرندے

حوالہ: یہ شعر جمیل نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مطلع ہے۔

تشریح: غزل کے مطلع میں شاعر پرندے سے خطاب کرتے ہوئے انسانوں کو کہتے ہیں کہ تیری قسمت خراب ہے کہ ہر طرف مسائل اور پریشانیوں کی آگ پھیلی ہوئی ہے۔ جب زندگی مسائل سے دوچار ہو تو خوشحالی نہیں رہ سکتی۔ انسانی زندگی میں بے روزگاری، مفلسی، بھوک، افلاس، بیماریاں اور سیاسی و سماجی بے چینی اور دیگر مسائل ہیں جس کے سبب زندگی مسائل سے دوچار ہے۔ اور انسان بھی ان مسائل کا شکار ہے۔ اس لئے شاعر انسان کی قسمت کو پھوٹی قسمت والا کہتا ہے۔

مرکزی خیال: انسان کی قسمت خراب ہے اور چاروں طرف مسائل کی آگ پھیلی ہوئی ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ مسائل کا حل نکالے اور زندگی کو خوشگوار بنائے۔

شعر: بال و پر کترے گی دنیا بھاگ یہاں سے بھاگ پرندے

حوالہ: یہ شعر جمیل نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ یہ غزل کا مطلع ہے۔

تشریح: غزل کے اس شعر میں شاعر پرندے سے خطاب کرتے ہوئے انسانوں کو کہتے ہیں کہ دنیا مسائل سے دوچار ہے۔ اور انسان کو مشکلات میں ڈال دے گی۔ اس لئے شاعر کہتے ہیں کہ اے انسان تو مسائل سے دو ہو جا۔ اور اپنے لئے ایسی جگہ دیکھ لے جہاں چین وسکون ہو۔ جب انسان کے ساتھ حالات اچھے نہ ہوں تو گھر، سماج اور ماحول اسے مشکلات میں ڈال سکتا ہے۔ اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ انسان برے حالات سے اپنے آپ کو بچائے اور ایسے مقام پر منتقل ہو جائے جہاں اسے چین وسکون حاصل ہو۔ اور اپنی زندگی خوشگوار ماحول میں گذار سکے۔

مرکزی خیال: دنیا انسان کا امتحان لیتی ہے۔ اور اسے مشکلات میں ڈال دیتی ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے لئے پرسکون مقام تلاش کر لے۔

شعر: سورج کا عفریت ہے اوپر اور زمیں پر ناگ پرندے

حوالہ: یہ شعر جمیل نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: غزل کے اس شعر میں شاعر انسانوں کو کہتے ہیں کہ مسائل سے بھری دنیا میں انسان کو کہیں چین وسکون نہیں ہے۔ شاعر سورج کی گرمی کا ذکر کرتے ہوئے قدرت کی جانب سے آنے والی آفات کا ذکر کرتا ہے کہ سیلاب، طوفان، قحط، زلزلے بھاری جانی و مالی نقصان لاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انسانی زندگی کے زمینی مسائل ہیں۔ جیسے بے روزگاری، بھوک، افلاس، سیاسی عدم استحکام، معاشی عدم مساوات اور دیگر انسانی وسماجی مسائل ہیں جس کے سبب زندگی میں پریشانیاں ہیں۔ ان کے حل کے لئے انسان کو عزم واستقلال کے ساتھ کام کرنا چاہئے۔

مرکزی خیال: انسان کے لئے قدرتی و دنیاوی مسائل ہوتے ہیں۔ جن کا سامنا کرتے ہوئے انسان کو اپنے مسائل خود حل کرنے چاہئیں۔

شعر: رستوں پر بارود بچھی ہے گلیوں گلیوں آگ پرندے

حوالہ: یہ شعر جمیل نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: غزل کے اس شعر میں شاعر پرندے سے خطاب کرتے ہوئے انسانوں کو کہتے ہیں کہ زندگی کی راہوں میں چاروں طرف مشکلات اور پریشانیوں کی شکل میں بارود بچھی ہے جو اپنے راستے میں آنے والے انسانوں کو تباہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ شاعر ماحول کی اس خطرناک تصویر پیش کرتے ہوئے لوگوں کو متنبہ کر رہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس ماحول سے بچائے اور اپنے لئے اور دوسروں کے لئے چین وسکون والا ماحول تیار کرے تب ہی زندگی میں خوشحالی آسکتی ہے۔

مرکزی خیال: زندگی میں جب حالات سازگار نہ ہوں تو انسان کے لئے پریشانیاں اور مسائل گولہ بارود اور آگ بن جاتے ہیں۔ انسان کو چاہئے کہ وہ مسائل کو حل کرے اور زندگی کو خوشگوار بنائے۔

شعر: دور کہیں پھر اڑ جانا آئے نظر جو آگ پرندے

حوالہ: یہ شعر جمیل نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: غزل کے اس شعر میں شاعر پرندے سے خطاب کرتے ہوئے انسانوں کو کہتے ہیں کہ اگر کسی کو کسی علاقے میں زندگی گذارنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو اسے چاہئے کہ نقل مکان اور نقل مقام کر لے اور ایسی جگہ چلا جائے جہاں امن اور چین وسکون ہو۔ جن علاقوں

میں غلامی ہوتی ہے اور لوگوں پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں وہاں کے عوام آزادی کی تلاش میں رہتے ہیں اور جب انہیں آزادی نہ ملے تو وہ ہجرت کر کے کسی پرسکون مقام کو جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاعر نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ امن والے علاقے کی طرف کوچ کر جائیں۔

مرکزی خیال: اگر کسی علاقے میں زندگی مسائل سے دوچار ہو تو انسان کو امن والے علاقے میں جانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

شعر:

اُس کا دشمن ایک زمانہ
جو بولے بے لاگ پرندے

حوالہ: یہ شعر جمیل نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: غزل کے اس شعر میں شاعر پرندے سے خطاب کرتے ہوئے انسانوں کو کہتے ہیں کہ جو لوگ سچ بات کرتے ہیں اور کھری کھری سنا دیتے ہیں اس کے ساتھ لوگ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اگر کوئی غلط کام کرے اور اس کی غلطی کی کوئی نشاندہی کر دے تو سامنے والے کو اچھا نہیں لگتا اور اس کے بارے میں سچ بولنے والے کے ساتھ دشمنی کی جاتی ہے۔ جب کہ حق اور سچائی کو قبول کر لینا چاہئے لیکن آج زمانے میں بے لاگ بولنے والوں کو پسند نہیں کیا جاتا اور جھوٹی تعریف کرنے والوں اور چاپلوسی کرنے والوں کو پسند کیا جاتا ہے۔ یہ ایک سماجی برائی ہے جس کو دور کرنے کی ضرورت ہے ورنہ غلطی پر نہ ٹوکا جائے تو سماج میں برائیاں عام ہو جائیں گی اور زندگی مشکلات سے دوچار ہو جائے گی۔

مرکزی خیال: جو لوگ دنیا میں حق بولتے ہیں اور بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں ان کے ساتھ دنیا والے دشمنی کرتے ہیں۔

شعر:

شائد میری بات لگی ہے
بے موسم کا راگ پرندے

حوالہ: یہ شعر جمیل نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: غزل کے اس شعر میں شاعر پرندے سے خطاب کرتے ہوئے انسانوں کو کہتے ہیں کہ میں ایک ناصح کی طرح لوگوں کو اچھی باتیں کہتا رہتا ہوں۔ لیکن لوگوں کو اچھی بات جو کبھی کڑوی بھی ہوتی ہے سننا اچھا نہیں لگتا اور لوگ اچھی بات کرنے والوں کو دیوانہ پاگل سمجھتے ہیں اور ان کی باتوں کو بے موسم کا گیت کہتے ہیں۔ لیکن انہیں بعد میں احساس ہوتا ہے کہ وہ شخص جو اچھی باتیں کہتا تھا سچا تھا۔ اس طرح شاعر اپنے آپ کو لوگوں کا ہمدرد اور ناصح بن کر پیش ہوتا ہے۔

مرکزی خیال: شاعر کی باتیں اچھی ہوتی ہیں لیکن انہیں لوگ بے وقت کا راگ کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں جس سے شاعر کو تکلیف ہوتی ہے۔

شعر:

سستی شہرت جھوٹی مایا
ہے صابن کا جھاگ پرندے

حوالہ: یہ شعر جمیلؔ نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: غزل کے اس شعر میں شاعر پرندے سے خطاب کرتے ہوئے انسانوں کو کہتے ہیں کہ انسان شہرت کے لئے بہت کچھ کرتا ہے دکھاوا کرتا ہے دولت خرچ کرتا ہے اور بھی بہت سے کام کرتا ہے۔ لیکن دکھاوے کی سستی شہرت سے کچھ نہیں ہوتا۔ صابن کے جھاگ کی طرح مختصر مدت میں انسان کی شہرت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ انسان اگر لوگوں کے دل جیتنے والے کام کرے اور لوگوں سے سچی محبت سے پیش آئے تو اسے ملنے والی شہرت دائمی ہوتی ہے۔ انسان کو دولت خرچ کر کے شہرت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ جیسا کہ آج کل کے سیاست دان اور دیگر دولت مند لوگ کر رہے ہیں۔

مرکزی خیال: سستی شہرت جانے والی چیز ہے۔ انسان کو حقیقی شہرت حاصل کرنے کے لئے لوگوں کے دل جیتنے والے کام کرنے چاہئیں۔

بات میری یہ دھیان میں رکھنا
یہ دنیا ہے گھاگ پرندے

حوالہ: یہ شعر جمیلؔ نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: غزل کے اس شعر میں شاعر پرندے سے خطاب کرتے ہوئے انسانوں کو کہتے ہیں کہ اے انسان میری بات دھیان سے سن لے کہ یہ دنیا بڑی چالاک اور دھوکے باز ہے۔ اس سے بچ کر رہنا چاہئے۔ دنیا کے ہنگامے اور رنگینیاں انسان کو خدا کی یاد سے غافل کر دیتی ہیں۔ انسان اپنے مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔ اور بعد میں افسوس کرنے لگتا ہے۔ اس لئے تجربہ کار شاعر کی بات مان لینی چاہئے اور دنیا کے دھوکے سے بچ کر اپنی زندگی کو کامیاب اور بامقصد بنانا چاہئے۔

ورنہ پھر پچھتائے گا تو
نیند سے اب تو جاگ پرندے

حوالہ: یہ شعر جمیلؔ نظام آبادی کی غزل سے لیا گیا ہے۔

تشریح: غزل کے اس شعر میں شاعر پرندے سے خطاب کرتے ہوئے انسانوں کو کہتے ہیں کہ اے انسان تو خواب غفلت سے جاگ اور میری بات سن لے اگر تو اس زندگی میں وقت کی قدر نہیں کرے گا اور زندگی کو کامیاب بنانے کی کوشش نہیں کرے گا اور اپنی زندگی بے کاری میں غفلت کے ساتھ گذار دے گا تو اس دنیا میں اور آخر میں پچھتائے گا کہ ہائے میں نے اپنی زندگی غفلت اور بے کاری میں کیوں گذار دی۔ اس لئے شاعر کی تنبیہ پر تمام انسانوں کو جاگ جانا چاہئے اور حرکت اور عمل کے ساتھ اپنی زندگی کو کامیاب بنانا چاہئے۔

مرکزی خیال: شاعر جمیلؔ نظام آبادی خواب غفلت میں ڈوبے انسان کو جگاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تو اب بھی میری بات نہیں مانتا ہے اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کرتا ہے تو تو دنیا اور آخرت میں ناکام رہے گا۔

**سوال: نظم کی تعریف کیجئے۔**

**جواب: نظم کی تعریف:** اشعار کا ایسا مجموعہ جس میں کسی ایک خیال کو تسلسل سے بیان کیا جائے اسے نظم کہتے ہیں۔ نظم کے لغوی معنیٰ ''لڑی میں موتی پرونے'' کے ہیں۔ تنظیم، ترتیب، نظم وضبط کے مفاہیم میں بھی اس لفظ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جس طرح ہم پورے ادب کو نظم ونثر میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسی طرح پوری شاعری کو ہم غزل اور نظم میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یہ نظم کے محدود تر اور جدید تر معنی ہیں۔ ادب میں جب نظم کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس

کے معنی نثر کے مخالف مفہوم کے ہوتے ہیں۔ اور اس میں ان ساری اصناف کو شامل کر لیا جاتا ہے۔ جو نثر میں نہیں ہیں۔ جیسے مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، غزل، رباعی، نظم وغیرہ۔ گویا لفظ ''نظم'' وسیع تر معنوں میں ساری شاعری کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے لیکن بطورِ اصطلاح اس لفظ کے معنی کسی خاص عنوان، ترتیب اور تسلسل کے ساتھ شاعری میں اظہارِ خیال کے ہیں۔ نظم میں ایک مرکزی خیال ہوتا ہے اور معنوی سطح پر اس میں ارتقاء بھی ضروری ہے۔ نظم میں تسلسل اور تاثر بھی ہونا چاہیے۔ نظم کیلئے نہ تو ہیت کی قید ہے اور نہ موضوعات کی اور نہ اشعار کی۔ چنانچہ اُردو شاعری میں مختلف ہیئتوں اور مختلف موضوعات پر نظمیں کہی گئی ہیں جیسے مخمس، مسدس اور غزل کی ہیئت میں۔ نظم میں اشعار کی تعداد بھی مختلف رہی ہے۔ نظم کی چار قسمیں مشہور ہیں۔ پابند نظم۔ معریٰ نظم۔ آزاد نظم اور نثری نظم۔ لیکن پابند نظم میں بحر اور قافیہ وغیرہ تک ترتیب اور پابندی ضروری ہے۔ غزل کا ہر شعر معنوی اعتبار سے آزاد اور مکمل ہوتا ہے۔ جبکہ نظم میں ایک شعر دوسرے سے مربوط ہوتا ہے۔ غزل میں موضوعی اعتبار سے کثرت ہوتی ہے لیکن نظم میں وحدت۔ نظم کے اشعار موضوع اور خیال کے اعتبار سے ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ہیں یہ وہ صنف سخن ہے جو غزل کے مقابل ہر زمانے میں موجود رہی ہے۔ اور جسکی مثالیں ہمیں محمد قلی قطب شاہ سے لے کر عہد حاضر تک بہ کثرت ملتی ہیں۔ پابند نظم کے مشہور شعرا میں قلی قطب شاہ، نظیر اکبر آبادی، اکبر الہ آبادی، اقبال، حالی، چکبست، سرور جہاں آبادی، تلوک چند محروم، جان نثار اختر، اختر الایمان وغیرہ مشہور ہیں۔

جدید نظم گو شعراء میں تصدیق حسین خالد، میراجی، فیض احمد فیض، مجید امجد، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، اختر الایمان، قاضی سلیم، کمار پاشی، بلراج کومل، عزیز قیسی، وحید اختر، سلیمان اریب اور شاذ تمکنت قابل ذکر ہیں۔ نظم معری اور آزاد نظم کے بعد جدید اردو شاعری میں نثری نظم کا بھی تجربہ بھی ہوا۔ جس میں کسی بحر کی پابندی نہیں ہوتی بلکہ صرف آہنگ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ نثری نظم ابھی تجرباتی مراحل میں ہے۔

## نظم۔ اے شریف انسانو!  از: ساحر لدھیانوی

**سوال: ساحر لدھیانوی کا تعارف بیان کیجئے۔**

**جواب:** ساحر لدھیانوی کا تعارف:۔ عبدالحئی ساحر لدھیانوی (1921) مشہور گیت کار گذرے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد ممبئی میں فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے۔ ان کے فلمی گانے بہت مشہور ہیں۔ ساحر کی مشہور نظمیں ''تاج محل، پرچھائیاں گریز، کسی کو اداس دیکھ کر اور ''اے شریف انسانو'' ہیں۔ ساحر کے شعری مجموعے تلخیاں اور ''آو کہ کوئی خواب بنیں'' ہیں۔ انہوں نے تاشقند معاہدہ کی سالگرہ کے موقع پر جنگ کی مخالفت میں اور امن کی تعریف میں یہ نظم ''اے شریف انسانو'' لکھی۔

**سوال: نظم ''اے شریف انسانو! کا خلاصہ لکھو۔**

**جواب:** نظم ''اے شریف انسانو! ساحر لدھیانوی نے لکھی۔ یہ نظم تاشقند معاہدے کے موقع پر امن کی خاطر لکھی گئی۔

خلاصہ:۔ ساحر نظم کے آغاز میں ایک ناصح کی طرح خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسانی خون کی بڑی عظمت ہے لوگوں کو اپنے اور پرائے میں تقسیم کرتے ہوئے کسی کا خون بہانا اچھا نہیں ہے خدا نے انسان کو اس زمین پر پرامن رہنے کیلئے بھیجا ہے کچھ لوگ شیطان کے دوست ہو جاتے ہیں اور اپنے ذاتی فائدہ کیلئے جنگ کے نام پر شیطانی حرکتیں کرتے ہیں اس سے ساری دنیا کا امن خطرے میں پڑ جاتا ہے اس لئے ساحر کہتے ہیں کہ جنگ دنیا کے مشرقی حصے میں ہو یا مغربی حصے میں یہ جنگ نہیں بلکہ عالمی امن کا خون ہے۔ سائنس کی ترقی کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ انسان نے ہتھیار کے نام پر اپنے ہاتھوں سے اپنی بربادی کا سامان کرلیا ہے۔ جنگ میں تباہی والے بم گرائے جاتے ہیں جس سے ملک کی سرحدیں اور رہائشی علاقے برباد ہو جاتے ہیں مکان کھنڈر بن جاتے ہیں ایک مکان کو تعمیر کرنا مشکل ہو جاتا ہے مکانوں میں زندگی رہتی ہے لیکن ایک بم تھوڑی

دیر میں سینکڑوں مکان برباد کر دیتا ہے اور ہزاروں زندگیاں اجڑ جاتی ہیں اس لئے ساحرؔ زور دے کر کہتے ہیں کہ جنگ کے نام پر بم ڈالنے سے زندگی کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اور ٹوٹے مکان اجڑی زندگیاں بسانے کیلئے کافی دولت ومحنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بم ڈالنے سے کھیت جل جاتے ہیں اناج کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اور ٹوٹے مکان اُجڑی زندگیاں بسانے کیلئے کافی دولت ومحنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بم سے زمین برباد ہو جاتی ہے جنگ میں اکثر ہار ہوتی ہے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ مجھے فتح ملی ہے اور وہ جشن مناتا ہے تو اس کا یہ جشن ہارنے والوں کی لاشوں پر ہوتا ہے۔ اس لئے کسی کو برباد کر کے خوش ہونا اچھا نہیں ہے۔ ساحرؔ ایک اہم بات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنگ بڑا مسئلہ ہے جنگ کے ساتھ آگ اور خون ہوتا ہے اور جنگ کے ختم ہونے کے بعد انسانی ضرورتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اس لئے ساحرؔ لدھیانوی دنیا کے سمجھدار انسانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے شریف انسانو! اگر ایسی وجہ جنگ کا ماحول بھی ہو تو جنگ کو ٹالنا چاہئے۔ اور لوگوں کو امن کی حالت میں چین و سکون سے اپنے گھروں میں رہنے دینا چاہئے۔ یہی بڑی عقلمندی ہے۔

نظم کے دوسرے حصہ میں ساحرؔ کچھ تجاویز پیش کرتے ہیں تا کہ جنگ کو ٹالا جا سکے۔ ساحرؔ کہتے ہیں کہ کسی پر اپنی برتری ثابت کرنے کیلئے کیا جنگ ضروری ہے جبکہ تعلیم وصحت کھیل کود اور دیگر شعبوں میں ترقی کرتے ہوئے۔ ایک ملک دوسرے ملک پر اپنی برتری ثابت کر سکتا ہے۔ اولمپک گیمس دنیا بھر میں ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی اچھی مثال ہیں۔ جاپان نے سائنس اور ٹکنالوجی میں امریکہ پر بھی برتری ثابت کر دی۔ اس طرح جنگ ہی برتری دکھانے کا ذریعہ نہیں ہے۔ ساحرؔ کہتے ہیں کہ اپنے گھر کے اندھیرے کو مٹانے کسی اور کا گھر جلانا درندگی اور دیوانہ پن ہے آج امریکہ پٹرول کی خاطر دنیا بھر میں جنگ کرتے ہوئے آگ لگا رہا ہے اور سب ہی چپ ہیں یہ امریکی درندگی نہیں تو اور کیا ہے۔ ساحرؔ کہتے ہیں کہ انسان کو جنگ لڑنے کیلئے دوسرے میدان بھی ہیں صرف خون بہانا ہی جنگ نہیں۔ بلکہ عقل کو استعمال کرتے ہوئے زندگی کے دیگر میدانوں میں ترقی کر سکتے ہیں۔

دنیا میں جہالت کا اندھیرا چھایا ہوا ہے علم کو عام کرنے کی جنگ کرتے ہوئے جہالت کو دور کیا جا سکتا ہے۔ ادیب اور شاعر اپنے افکار کے ذریعہ یہ کام کر سکتے ہیں اور اقبال نے اپنی فطری وفلسفیانہ شاعری کے ذریعہ یہ کام کر دیا۔ دنیا میں امن قائم رکھنے کیلئے اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے لیکن اقوام متحدہ جنگوں کو ٹالنے میں ناکام رہا۔ چنانچہ اقوام متحدہ کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے دنیا میں پھیلی بربریت' لوٹ مار' غارت گیری قتل وخون کو روکنے کیلئے انسان کو جدوجہد کرنا ہے آج کی سیاست گندی ہوگئی ہے دھوکہ دہی جھوٹ اور رشوت عام ہوگئی سیاست سے ان برائیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ دنیا میں پھیلی غربت Dectatorship سرمایہ دارانہ نظام اور جنگی ذہن رکھنے والوں کے خلاف بھی امن پسند مہذب لوگوں کو جدوجہد کرنا چاہئے۔ اس طرح کی جدوجہد دنیا میں دیرپا امن قائم رکھ سکتی ہے۔

**مرکزی خیال:**۔ ساحرؔ لدھیانوی نے اپنی نظم ''اے شریف انسانو!'' کے ذریعہ یہ پیغام دیا ہے کہ ملکوں پر قبضے کے ذریعہ جو جنگیں ہو رہی ہیں اس سے انسانیت کو بھاری نقصان ہو رہا ہے جبکہ انسانیت کی ترقی کے کام کرتے ہوئے دنیا میں تہذیبی' سماج ومعاشرتی ترقی کی جا سکتی ہے۔

## نظم۔ تیری میری آس وہی ہے (گاندھی جی کا ایک ہریجن سے خطاب)

محمد ایوب فاروقی صابرؔ

**سوال: محمد ایوب فاروقی صابرؔ کا تعارف بیان کیجئے۔**

**جواب:** محمد ایوب فاروقی صابرؔ شہر نظام آباد سے تعلق رکھنے والے کہنہ مشق شاعر، افسانہ نگار اور ادیب ہیں۔ بہ حیثیت ایمپلائمنٹ آفیسر عادل آباد سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ لیکن اپنے وطن نظام آباد میں ملازمت کا طویل عرصہ گذارا۔ انجمن ترقی اردو شاخ نظام آباد کے سرگرم کارکن رہے۔ نظام آباد میں قیام کے دوران شعری اور ادبی محفلوں میں شرکت کرتے رہے۔ وظیفہ پر سبکدوشی کے بعد ٹولی چوکی حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اردو شاعری سے انہیں فطری مناسبت رہی۔ اور بچپن سے ہی شعر گوئی کا سلسلہ جاری رکھا۔ ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ زمانہ طالب علمی میں ڈگری کالج ورنگل کے کالج میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ بعد میں مقامی ہفت روزہ و سہ ماہی اخبارات و رسائل میں مضامین لکھتے ہوئے صابرؔ نے اردو ادب کی گراں بہا خدمات انجام دیں۔ جامعہ عثمانیہ میں تعلیم کے دوران حیدرآباد کا ادبی ماحول دیکھا۔ کچھ عرصہ ایم اے اردو میں بھی داخلہ لیا تھا۔ اس وقت پروفیسر مسعود حسین خان جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کے صدر تھے۔ اور پروفیسر سیدہ جعفر اور پروفیسر اشرف رفیع رفقاء میں تھے۔ مخدوم کو کلام سناتے ہوئے دیکھا اور شاذ تمکنت کی شاگردی میں بھی رہے۔ ملازمت کی جستجو میں اعلیٰ تعلیم جاری نہیں رکھ سکے۔ محمد ایوب فاروقی صابرؔ کا ایک شعری مجموعہ ''آخر شب کے ہمنشیں'' شائع ہو کر مقبول ہوا۔ اس شعری مجموعے کی رسم اجراء کے موقع پر عادل آباد میں ایک عظیم الشان مشاعرہ، ادبی محفل، محفل افسانہ اور محفل لطیفہ گوئی منعقد کی۔ جو عادل آباد کی ادبی تاریخ کی ایک یادگار ادبی محفل تھی۔ مشاعرے میں نامور شاعر منشا الرحمٰن خان منشاء نے ناگپور سے شرکت کی۔ اور کتاب کا رسم اجراء انجام دیا۔

نظم

تیری میری آس وہی ہے (گاندھی جی کا ایک ہریجن سے خطاب)

سورج سونا بکھراتا ہے تیرے گھر بھی میرے گھر بھی
خوشبو کا جھونکا آتا ہے تیرے گھر بھی میرے گھر بھی
چاند آنگن میں اتراتا ہے تیرے گھر بھی میرے گھر بھی

انسان جانے کوئی نہ جانے یہ دوجا وہ ہرجائی ہے
یہ اپنا ہے وہ بے گانہ یہ ہے پرایا وہ بھائی ہے

سوکھا ہو تو اک اک بوند کو میں بھی ترسوں تو بھی ترسے
جب بادل گھر گھر کر آئیں گیت کی لے اُٹھے ہر گھر سے
کھیتوں میں اور کھلیانوں میں رم جھم رم جھم ورشا برسے
لیکن ورشا یہ تو نہ جانے یہ دوجا وہ ہرجائی ہے
یہ اپنا ہے وہ بے گانہ یہ ہے پرایا وہ بھائی ہے

برگد کے ہر پیڑ کی چھایا تیرے لئے بھی میرے لئے بھی

جلتی دھوپ میں ٹھنڈا سایہ تیرے لئے بھی میرے لئے بھی
پروائی کا جھونکا آیا تیرے لئے بھی میرے لئے بھی

دھوپ اور چھاؤں یہ تو نہ جانے یہ دوجاوہ ہرجائی ہے
یہ اپنا ہے وہ بے گانہ یہ ہے پرایا وہ بھائی ہے

خون وہی ہے سانس وہی ہے درد وہی احساس وہی ہے
تیرے میرے جسم کے اندر بھوک وہی ہے پیاس وہی ہے
آنے والے اچھے کل سے تیری میری آس وہی ہے

تیرا میرا درد نہ جانے یہ دوجاوہ ہرجائی ہے
یہ اپنا ہے وہ بے گانہ یہ ہے پرایا وہ بھائی ہے

**سوال: نظم ''تیری میری آس وہی ہے'' کا خلاصہ لکھو۔**

**جواب: تعارف:** محمد ایوب فاروقی صابرؔ ضلع نظام آباد سے تعلق رکھنے والے اردو کے مشہور شاعر ہیں۔ان کا شعری مجموعہ ''آخر شب کے ہمنشیں'' شائع ہو چکا ہے۔ان کی ایک نظم ''تیری میری آس وہی ہے'' ہے۔اس نظم میں شاعر نے ذات پات کے نظام کی برائی بیان کی ہے۔نظم کا خلاصہ اس طرح ہے۔

**خلاصہ نظم:** محمد ایوب فاروقی صابرؔ نے نظم ''تیری میری آس وہی ہے'' میں گاندھی جی کا ہریجن سے خطاب کے عنوان سے مکالمہ پیش کیا ہے۔اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ قدرت نے انسان کو یکساں پیدا کیا ہے تو انسانوں کو آپس میں ذات پات کے نام پر تفریق نہیں کرنا چاہئے۔نظم کے پہلے بند میں شاعر کہتے ہیں کہ سورج کی روشنی تیرے اور میرے گھر میں یکساں آتی ہے۔ہوا کی خوشبو بھی سب کے گھر میں ساتھ ساتھ آتی ہے۔ رات میں جب چاندنی پڑتی ہے تو وہ بھی سب کے گھروں کو یکساں روشن کرتی ہے۔یہ انسان ہی ہوتا ہے جو لوگوں میں بھید بھاؤ کرتا ہے اور ایک دوسرے سے فرق کرتا ہے جب کہ قدرت کی سورج کی روشنی، خوشبودار ہوائیں اور چاند کی چاندنی اپنی دولت کو عام کرتے ہوئے کبھی یہ نہیں دیکھتی ہیں کہ وہ کس کے گھر میں جارہی ہیں اور کس کے گھر میں نہیں جارہی ہیں۔وہ اپنے دولت کو عام کرنے میں اعلی اور ادنی ذات کا فرق نہیں کرتیں بلکہ سب کو یکساں طور پر فائدہ پہونچاتی ہیں جب کہ انسانوں میں عادت ہوتی ہے کہ وہ ذات پات اور فرقوں کی دیوار کھڑی کر دیتا ہے اور اپنے جیسے لوگوں میں بھید بھاؤ کرنے لگتا ہے۔۔نظم کے دوسرے بند میں شاعر محمد ایوب فاروقی صابرؔ کہتے ہیں کہ جب بارش نہیں ہوتی ہے اور قحط پڑتا ہے تو برہمن اور نچلے ذات کے انسان سب بارش کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں۔سوکھے کے بعد جب آسمان پر بادل گھر کر آتے ہیں تو اعلی ادنی سب انسانوں کے گھروں میں خوشی کے نغمے گائے جاتے ہیں۔جب کھیتوں اور میدانوں میں بارش رم جھم رم جھم کرتی برستی ہے تو ہر طرف خوشحالی چھا جاتی ہے۔لیکن بارش کبھی یہ نہیں سوچتی کہ وہ اعلی انسانوں کے کھیتوں کو سیراب کرے گی اور ادنیٰ انسان کو نہیں کرے گی بلکہ وہ یکساں طور پر سبھی

انسانوں کو سیراب کرے گی۔اسی طرح اگلے بند میں شاعر کہتے ہیں کہ برگد کے پیڑ کی گھنی چھاؤں تیرے لئے اور میرے لئے یکساں ہے۔کڑک دھوپ میں اگر کوئی اس پیڑ کے ٹھنڈے سائے میں آجائے تو دونوں کو سکون ملے گا۔ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سب کو اچھے لگتے ہیں۔دھوپ اور چھاؤں کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کے نیچے کھڑے ہونے والے انسان اپنے ہیں یا پرائے۔اللہ نے سب انسانوں کو ایک رنگ کا خون دیا ہے۔سب لوگ سانس لے کر زندہ رہتے ہیں۔دکھ درد سب کو یکساں محسوس ہوتے ہیں۔انسانوں کو لگنے والی بھوک اور پیاس سب یکساں ہے۔مستقبل میں خوشی اور بہتر دنوں کی آمد کا انتظار سب کو یکساں طور پر رہتا ہے۔درد کبھی یہ نہیں دیکھتا ہے کہ کون ادنیٰ ہے اور کون اعلیٰ یہ سب کو یکساں طور پر متاثر کرتا ہے۔خوشی اور غم اپنے پرائے کا فرق نہیں کرتے تو انسان کیوں اپنے جیسے لوگوں میں اونچ نیچ کرتا ہے بھید بھاؤ اور تفریق کرتا ہے۔اس لئے انسانوں کو چاہئے کہ وہ سب مل کر رہیں کسی کو ذات پات کی بنیاد پر کم یا زیادہ ادنیٰ اور اعلیٰ نہ سمجھیں تب ہی انسانیت کی بھلائی ہوسکتی ہے اور لوگ خوش رہ سکتے ہیں۔

مرکزی خیال:نظم ''تیری میری آس وہی ہے'' میں شاعر نے فطرت کے نظارے اور انسانوں کے سکھ دکھ کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ جب سورج کی روشنی، چاند کی چاندنی، ٹھنڈی ہوائیں، بارش، خوشی اور غم، دکھ درد سب کے لئے یکساں ہیں اور یہ کبھی اپنی دولت بانٹنے میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق نہیں کرتے تو انسانوں کے لئے بھی یہ اچھا نہیں کہ وہ ذات پات کے نام پر لوگوں میں تفریق کریں۔اور آپس میں پھوٹ ڈالیں۔جب بنانے والے نے سب کو یکساں بنایا اور سب کے دکھ سکھ ایک رکھے تو ہمارے لئے مناسب نہیں کہ ہم لوگوں میں تفریق کریں۔بلکہ آپسی میل ملاپ سے لوگوں میں اتحاد پیدا کریں۔

## مضمون۔ مرزا غالبؔ کے اخلاق و عادات وخیالات

از:مولانا الطاف حسین حالیؔ

**سوال:الطاف حسین حالیؔ کا تعارف بیان کیجئے۔**

**جواب: خواجہ الطاف حسین حالیؔ** (1837-1914) اُردو کے مشہور شاعر، انشا پرداز سوانح نگار اور نقاد گذرے ہیں۔غالبؔ کے شاگرد تھے اور سرسید کی اصلاحی تحریک میں حصہ لیا۔ابتداء میں قدیم طرز کی غزل گوئی کی۔بعد میں ادب کی مقصدیت کے قائل ہوئے انہوں نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں نظمیں سناتے ہوئے نظم گوئی کو فروغ دیا۔مشہور مسدس مدوجزر اسلام 1879ء میں لکھی۔سوانح نگاری میں آپ کی یادگار کتابیں حیات سعدی 1882ء یادگار غالب 1897 اور حیات جاوید 1901ء مشہور ہیں۔اپنی شاعری کے مجموعہ کو ایک طویل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا جس میں شاعری کے بارے میں اُصولی بحثیں کی گئیں۔بعد میں یہ کتاب ''مقدمہ شعروشاعری'' کے عنوان سے 1893ء میں علٰحدہ شائع ہوئی اور اس کتاب کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ حالیؔ ''جدید اُردو تنقید کے بانی'' قرار پائے۔ان کی مثنویاں حب وطن، مناجات بیوہ اور چپ کی داد مشہور ہیں۔حالیؔ کا انتقال ۱۹۱۴ء ہوا۔

**سوال:۔حالیؔ نے غالب کی شخصیت کے کن پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے؟ تفصیل سے لکھئے۔(یا) غالب کے اخلاق و عادات کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجئے۔**

**جواب:**۔حالیؔ کا تعارف:۔مولانا الطاف حسین حالیؔ (1837-1914) اردو کے مشہور شاعر، ادیب، نقاد اور سوانح نگار گذرے ہیں۔سرسید احمد خان

کی علی گڑھ تحریک سے متاثر رہے۔اور ادب برائے زندگی نظریے کے تحت ادب کے مقصدی پہلو کو اجاگر کرتے رہے۔حالؔی، غالبؔ کے شاگرد تھے۔اور غالبؔ کے انتقال کے بعد ان کے سوانحی حالات پر مبنی ایک کتاب ''یادگار غالبؔ'' کے عنوان سے لکھی۔اس کتاب میں حالؔی نے غالبؔ کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔اس کتاب سے ایک اقتباس ''مرزا غالب کے اخلاق و عادات'' لیا گیا ہے۔جس میں حالؔی نے غالبؔ کے اخلاق و عادات بیان کئے ہیں۔اس مضمون کا خلاصہ پیش ہے۔

خلاصہ مضمون:۔الطاف حسین حالؔی کے اخلاق و عادات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالبؔ کے اخلاق نہایت وسیع تھے وہ لوگوں سے کھلے دل سے ملتے تھے۔لوگ اُن کے برتاؤ سے اس قدر متاثر ہوتے کہ جو شخص ایک دفعہ ان سے ملتا بار بار اُن سے ملنے کی خواہش رکھتا تھا۔غالبؔ دوستوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے اور اُن کی خوشی اور غم میں اپنے آپ کو شامل رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے حلقہ احباب اور دوستوں میں دہلی اور ملک بھر میں مذہب و ملت کے کئی لوگ شامل تھے۔غالبؔ جن دوستوں کو خط لکھتے ان میں محبت کا اظہار کرتے وہ ہر خط کا جواب دیتے تھے ان کا بہت سا وقت دوستوں کو خط لکھنے میں گذرتا تھا۔بیماری کی حالت میں بھی خط لکھنا نہیں چھوڑتے تھے۔اگر کوئی بے رنگ خط بھیجتا یا لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تو وہ ناراض ہو جاتے۔وہ لوگوں سے مروت اور لحاظ کا اظہار کرتے۔اخیر عمر میں اشعار کی اصلاح سے معذرت کرنے لگے تھے۔

غالبؔ کی آمدنی کم تھی لیکن وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کی جہاں تک ہو سکے بھرپور مدد کرتے تھے۔غدر کے بعد ان کی آمدنی ڈیڑھ سو روپئے ماہوار تھی۔اس میں سے بھی ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہتے۔مدد کیلئے انہوں نے اپنے انعامات بیچنا بھی گوارا کیا۔دہلی کے علمائے دین میں کچھ لوگ حالات کا شکار ہو کر غریب ہو گئے تھے اور عزت کی خاطر کسی سے مانگنے سے شرماتے تھے۔غالبؔ غیر محسوس طریقے سے ان لوگوں کی مدد کرتے تھے۔اسی طرح اک عمائد سے ان کا کم قیمت فرغل لے کر اپنا قیمتی کپڑا دیا۔

حالؔی، مرزا کے حافظے اور ذہانت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالبؔ کی طبعیت میں نئی باتیں سوچنے کی صلاحیت تھی۔ان کا حافظہ تیز تھا۔کتابیں پڑھتے تو اہم باتوں کو یاد کر لیتے۔کلام میں کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے جس کی سند نہ ہو۔غالبؔ کم بات کرتے تھے لیکن جب بھی بات کرتے پر لطف گفتگو کرتے۔یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔حالؔی نے ان کے مزاج میں پائے جانے والی ظرافت کو دیکھ کر لکھا کہ انہیں ''حیوان ناطق کے بجائے حیوان ظریف'' کہا جائے تو بہتر ہوگا۔حسن بیان، حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا غالبؔ کی تحریر و تقریر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔غالبؔ نے اپنے احباب سے جو پر مزاح گفتگو کی اس دوران ان کے کئی لطائف مشہور ہوئے۔ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ گرمی کے موسم میں تھا مرزا روزے نہیں رکھتے تھے۔لو سے بچنے کیلئے کوٹھری میں بیٹھے مرزا دوست کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔مولانا آزادؔ نے ان سے پوچھا مرزا ہم نے سنا تھا رمضان میں شیطان بند رہتا ہے۔آج اس بات پر یقین نہیں آتا مرزا نے کہا بات بالکل صحیح ہے لیکن جس جگہ شیطان بند رہتا وہ جگہ یہی ہے۔رمضان کے بعد قلعہ گئے تو بادشاہ نے پوچھا مرزا تم نے کتنے روزے رکھے۔غالبؔ نے جواب دیا ایک نہیں رکھا۔اس طرح غالبؔ کی ہر بات لطف سے خالی نہیں ہوتی تھی۔غالبؔ وضع دار انسان تھے۔پالکی میں بیٹھ کر باہر نکلتے جوان سے نہیں ملنا چاہتا وہ بھی اس سے نہ ملتے۔غالبؔ کی غذا اچھی تھی انہیں گوشت بہت پسند تھا۔غذا میں انڈے، شامی کباب، روٹی وغیرہ استعمال کرتے تھے۔پھلوں میں آم بہت پسند تھے۔لوگوں سے تقاضہ کر کے اچھے اچھے آم منگواتے تھے۔ایک دفعہ بادشاہ کے ساتھ آموں کے باغ میں ٹہل رہے تھے وہ آموں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔بادشاہ نے پوچھا مرزا کیا دیکھ رہے ہو، غالبؔ نے کہا کہ میں نے سنا تھا کہ دانے دانے پہ کھانے والے کا نام ہوتا ہے۔دیکھ رہا ہوں کہ ان آموں پر میرا نام کہاں ہے؟ مرزا کی یہ گفتگو سن کر بادشاہ نے آموں کی ٹوکری مرزا کے گھر بھجوادی۔ایک مرتبہ ان کے

دوست نے دیکھ کر کہا مرزا گدھا بھی آم نہیں کھا رہا ہے۔ غالب نے کہا کہ بے شک گدھے آم نہیں کھاتے۔ آم کی خصوصیات بیان کرنے کیلئے کہا گیا تو مرزا نے کہا کہ آم میٹھا ہو اور بہت ہو۔

مرزا کی شخصیت کا اک منفی پہلو یہ بھی تھا کہ وہ شراب پیتے تھے لیکن حالؔی کہتے ہیں کہ مرزا مقدار سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ اور شراب میں گلاب کا عرق ملا کر پیتے تھے اس سے شراب کا اثر کم ہو جاتا ہے۔

**مرکزی خیال:۔** الطاف حسین حالؔی نے اس مضمون میں غالبؔ کے اخلاق و عادات، لوگوں کے ساتھ ان کے برتاؤ، ان کی سخاوت، رحم دلی، ہمدردی و غمخواری، مزاج کی ظرافت وغیرہ خوبیوں کو بیان کیا ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جنہیں اپنا کر انسان سماج میں بہتر مقام حاصل کر سکتا ہے۔ انسان اگر اچھائی کو اختیار کرے اور برائی ترک کرے تو اس کی ذات لوگوں کیلئے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے۔ غالبؔ کی شخصیت کے یہ مثبت پہلو لوگوں کیلئے یقیناً مشعل راہ ہوں گے۔

انشائیہ: **پڑیے گر بیمار** از: مشتاق احمد یوسفی

**سوال: انشائیے کی تعریف بیان کیجئے۔**

**جواب:** انشائیے کی تعریف:۔ انشائیہ ہلکا پھلکا نثری مضمون ہوتا ہے۔ انشائیہ لکھنے والے کو انشائیہ نگار کہتے ہیں۔ انشائیہ میں زندگی کو پر لطف اور دلچسپ اسلوب کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ انشائیہ نگار دلچسپ انداز بیان کے ذریعے قاری پر تاثر چھوڑتا ہے۔ اردو میں خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ، مشتاق احمد یوسفی اور دیگر کئی مشہور انشائیہ نگار گذرے ہیں۔

**سوال: مشتاق احمد یوسفی کا تعارف بیان کیجئے۔ اور مضمون ''پڑیئے گر بیمار'' کا خلاصہ لکھئے۔**

**جواب:** مشتاق احمد یوسفی کا تعارف:۔ مشتاق احمد یوسفی اردو کے نامور مزاح نگار اور انشائیہ نگار ہیں۔ انہوں نے اپنے مزاحیہ مضامین سے اردو ادب میں علیحدہ شناخت بنائی ہے۔ مشاہدے کی وسعت، بات میں بات پیدا کرنا اور عام موضوعات کو دلچسپ انداز میں بیان کرنا یوسفی کی مزاح نگاری کی اہم خصوصیات ہیں۔ ان کے مضامین کے مجموعے چراغ تلے اور خاکم بدہن مشتاق احمد یوسفی ان دنوں پاکستان میں مقیم ہیں ان کا ایک مشہور مضمون ''پڑے گر بیمار'' ہے جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔

**مضمون کا خلاصہ:۔** مشتاق احمد یوسفی نے اپنے مزاحیہ مضمون ''پڑیے گر بیمار'' کے آغاز میں بطور تمہید لکھتے ہیں کہ باعزت طریقہ سے مرنا کسی ہنر سے کم نہیں۔ غالبؔ نے 1777ء میں وبائے عام میں مرنا پسند نہیں کیا۔ انسان کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ اپنی موت کو قبل از وقت اور شادی کو بعد از وقت قرار دیتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی اپنے آپ کو اس اکثریت میں شمار کرتے ہیں جو جینے کے ڈھنگ سے اور مرنے کے فن سے ناواقف ہیں۔

مضمون پڑیے گر بیمار میں مشتاق احمد یوسفی نے کسی مریض کی عیادت کیلئے آنے والوں کے برتاؤ پر روشنی ڈالی ہے۔ لوگ جب کسی مریض سے ملاقات کرتے ہیں تو اُسے پرہیز اور علاج کے بارے میں طرح طرح کے مشورے دیتے ہیں۔ اس طرح کے مشوروں سے مریض کی ناک میں دم آ جاتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو صحت مند رکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ ملنے آنے والوں کی زبردستی کے مشوروں سے بچا جا سکے۔ یوسفی لکھتے ہیں کہ میں لوگوں کے مشوروں پر عمل نہیں کرتا ہوں کیونکہ نیم حکیم خطرے جان کے مشوروں پر چلتے ہوئے اگر میں مر جاؤں تو میرے ناحق خون کا الزام کسی کے سر پر عائد ہو جائے گا۔ مشورہ دینے والوں کی زمرہ بندی کرتے ہوئے یوسفی لکھتے ہیں کہ مریض سے ملاقات کیلئے آنے والوں میں

پہلا زمرہ ان لوگوں کا ہے جو احتیاط کو علاج سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اور روکھا پھیکا کھانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ دوسرا گروہ وہ لوگ ہیں جو قوت ارادی سے کسی مرض کو دور بھگانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اور جب کبھی کسی مریض سے ملے تو اُسے خدا سے دعا کرنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ یوسفی لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں خطرناک امراض کیلئے بھی تعویذ گنڈوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ لوگ ان تعویزوں سے اچھے بھی ہوجاتے ہیں۔ تیسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو مرض کے بارے میں کرید کرید کر وکیل کی طرح سوالات کرتے ہیں۔ تیمارداری کیلئے آنے والوں کی نفسیات بیان کرنے کے بعد یوسفی چند لوگوں کے احوال بیان کرتے ہیں کہ کس طرح وہ بیماری کے دوران ان سے برتاؤ کرتے ہیں ایک بزرگ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ میری بیماری کے دوران ملاقات کیلئے آتے ہیں۔ اور آتے ہی کہتے ہیں کہ برخوردار دو گھنٹے سے ملیریا میں مبتلا ہو اور مجھے خبر تک نہ کی۔ میرے دل میں آتا ہے کہ اگر میں اطلاع دیتا تو آپ میرے ملیریا کا کیا بگاڑ لیتے۔ وہ ڈانٹتے بہت تھے کبھی کبھی شاعری میں ڈانٹتے تھے وہ آتے تو ایسا لگتا جیسے موت کا فرشتہ آیا ہے۔ ایک تیماردار کا حال بیان کرتے ہوئے یوسفی لکھتے ہیں کہ وہ چپکے سے کمرے میں داخل ہوتے اور لوگوں میں بیٹھ کر سرگوشیاں کرتے کہ مریض پر اب سکرات کا عالم طاری ہو چکا ہے۔ مریض یہ سن کر کہتا ہے کہ بھائی میں تو ابھی خیریت سے ہوں۔ یوسفی کے خاص دوست مرزا عبدالودود بیگ تھے وہ کہتے ہیں کہ بیماری جان کا صدقہ ہے میں کہتا ہوں کہ میرے لئے تو یہ صدقہ جاریہ ہو کر رہ گئی۔ ایک اور دوست مرزا تھے وہ تندرستی کو تمام پریشانیوں کی جڑ قرار دیتے ہیں اور بیمار رہنے کو اچھا سمجھتے تھے۔ دلیل کے طور پر کہتے ہیں کہ بڑے بڑے نبیوں پر ایسا وقت آیا ہے۔ ایک اور صاحب نفسیاتی طریقہ کا علاج بتاتے اور باتوں کے ذریعہ بیماری دور کرنا چاہتے تھے۔ یوسفی لکھتے ہیں کہ بیمار ہونے کے کئی نقصانات ہیں لیکن ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اپنے بارے میں لوگوں کی رائے معلوم ہو جاتی ہے۔

**مرکزی خیال:**۔ مشتاق احمد یوسفی نے اپنے مضمون ''پڑیے گر بیمار'' میں بیمار پڑنے کے بعد ملاقات کیلئے آنے والے تیمارداروں کی مختلف اقسام بیان کی ہیں اور ان کے برتاؤ کو مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ آج کل بیمار کی تیمارداری کیلئے آنے والے لوگ مریض کو سکون کم فراہم کرتے ہیں بلکہ غیر ضروری باتوں سے اس کے مرض میں اضافہ کر جاتے ہیں۔

## سلیمان اریب

(خاکہ) ازمجتبیٰ حسین

**سوال: مجتبیٰ حسین کا تعارف بیان کیجئے۔**

**جواب: مجتبیٰ حسین کا تعارف:** اردو کے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین 1932ء کو گلبرگہ میں پیدا ہوئے۔ ملازمت کے سلسلے میں دہلی میں رہے۔ ان دنوں دہلی اور حیدرآباد میں رہ رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے اپنی مزاح نگاری سے اپنی پہچان بنائی ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین ہلکے پھلکے اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ وہ بات میں سے بات پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اپنی مزاح نگاری کے ایک سلسلے کے طور پر انہوں نے اردو کے ادیبوں پر دلچسپ خاکے لکھے۔ سلیمان اریب حیدرآباد کے مشہور ادیب اور شاعر ہیں۔ اس خاکے میں مجتبیٰ حسین نے اریب کی یادوں کو پیش کیا ہے۔

**سوال: خاکے کی تعریف بیان کیجئے۔**

**خاکے کی تعریف:** خاکے کو مرقع بھی کہتے ہیں۔ انگریزی میں خاکے کے لئے Sketch استعمال کیا جاتا ہے۔ خاکہ اردو نثر کا ایسا مضمون ہوتا ہے جس میں خاکہ نگار کسی شخصیت کی لفظی تصویر پیش کرتا ہے۔ اور شخصیت کے عادات، رہن سہن اور طور طریقے بیان کرتے ہوئے ایک شخصیت کی مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خاکے میں خاکہ نگار کے جذبات بھی شامل ہوتے ہیں۔ مزاحیہ خاکہ میں شخصیت کا بیان مزاحیہ انداز میں ہوتا ہے۔

**سوال: خاکہ سلیمان اریب کا خلاصہ لکھو۔**

**جواب:** ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے حیدرآباد کے نامور شاعر اور رسالہ صبا کے ایڈیٹر سلیمان اریب کی شخصیت کے مختلف پہلو بیان کرتے ہوئے خاکہ ''سلیمان اریب'' لکھا ہے۔

**خلاصہ:** مجتبیٰ حسین نے سلیمان اریب سے ملاقاتوں اور مختلف واقعات کے ذریعہ اریب کی شخصیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ خاکے کے آغاز میں مجتبیٰ حسین نے سلیمان اریب اور ایک مستری کے درمیان ہوئے لطیفے کا تفصیلی ذکر کیا کہ اریب کے ساتھ اگر کوئی ہو تو میں اریب سے ملنے سے کتراتا تھا۔ کیونکہ اریب ہمیشہ مجھے مستری والا لطیفہ سنانے کے لئے کہتے تھے۔ میں نے اریب کے لئے یہ لطیفہ بنایا تھا کہ وہ اپنے مکان کے کمپاؤنڈ وال کو اونچا کرنے کے لئے ایک مرتبہ ایک مستری سے بات کرتے ہیں اور رقم کا انتظام ہونے کے بعد کام شروع کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ مستری کئی دفعہ اریب سے کام کے آغاز کے بارے میں دریافت کرتا ہے تو اریب اسے رقم نہ ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ایک دفعہ تنگ آکر مستری اریب سے پوچھتا ہے کہ رقم نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ تب اریب کہتے ہیں کہ ابھی ''صبا'' پریس میں ہے۔ ''صبا'' نکلے گا تو رقم کا انتظام ہوگا۔ تب مستری معصومیت سے کہتا ہے کہ صاحب ''صبا'' بھی میں ہی نکالوں گا اور دیوار بھی میں ہی بناؤنگا۔ سلیمان اریب کے بارے میں مجتبیٰ حسین نے مزید دو لطیفے جامی والا اور شاہ نور والا پیش کئے۔ اور لکھا کہ اریب اپنے بارے میں کئے جانے والے مذاق سے کبھی خفا نہیں ہوتے تھے۔ لطیفے کے دوران انہوں نے اریب کا خاکہ کھینچا اور لکھا کہ اریب کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں۔ رنگ گورا، قد اونچا، لمبے بال، کرتا پاجاما پہننے والی شخصیت اریب کی ہے۔ اس کے بعد مجتبیٰ حسین نے اریب سے گلبرگہ میں 1952ء میں مشاعرے کے سلسلے میں اپنی ملاقات کا حال بیان کیا، جب کہ انہوں نے رات کے دو بجے ریلوے اسٹیشن پر اریب کا آٹوگراف لیا تھا۔ تب شاہد صدیقی نے اریب سے مزاحیہ انداز میں کہا تھا کہ ابھی آٹوگراف دے دو تمہارا کلام سننے کے بعد تمہیں کوئی آٹوگراف نہیں دے گا۔

مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد کے کمرہ نمبر:17 میں ان کے ادبی رسالہ ''صبا'' کا دفتر تھا۔ جہاں وہ بیگ ہاتھ میں لئے پہونچتے تھے۔ اریب ''صبا'' پابندی سے نہیں شائع کرتے تھے۔ اس لئے مجتبیٰ حسین مزاحیہ انداز میں ان سے کہتے ہیں کہ ''صبا'' اردو کا واحد ماہنامہ ہے جو سال میں چار مرتبہ پابندی سے نکلتا ہے۔ اریب اور مشاعروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اریب چاہتے تو مشاعرے کو کامیاب بناتے اور چاہتے تو اسے ناکام کردیتے تھے۔ اریب سرتاپا شاعر تھے اور مشاعرے میں دوستوں کے ہمراہ جھوم کر آتے تھے۔ کلام سنانے سے پہلے ہی لوگوں سے داد وصول کرلیتے تھی۔ وہ ترنم اور تحت کو ملا کر شعر پڑھتے تھے۔ سلیمان اریب اپنی اہلیہ صفیہ کا تذکرہ بہت زیادہ کرتے تھے۔ اور چھوٹے بڑے مسئلہ کی رائے کا حوالہ دیتے۔ کسی نے اریب کو احمق کہا تو مجتبیٰ حسین نے مزاحیہ انداز میں کہ صفیہ کی بھی یہی رائے ہے۔ اس پر اریب مسکرانے لگے۔ مجتبیٰ حسین نے موت کے موضوع پر لکھی کہانیوں کے اریب کے حوالے کرنے اور شکستہ تحریر کے سبب اریب کی ان کہانیوں کو پڑھنے اور فیر کرنے میں معذرت کا ذکر کیا۔ اریب نے ''صبا'' میں نوجوان ادیبوں کو بہت موقع دیا۔

خاکہ کے آخر میں مجتبیٰ حسین نے اریب کی بیماری کا تفصیلی ذکر کیا اور لکھا کہ اریب کو کینسر ہوگیا تھا۔ ان کی آواز بیٹھ گئی تھے۔ مخدوم کی وفات پر تعزیتی جلسے میں مضمون پڑھنے کے بعد لوگوں نے ان پر انڈے پھینکے تھے۔ جس سے اریب غصے میں رہنے لگے تھے۔ ہوٹل میں ملاقات کے دوران مجتبیٰ حسین نے اریب سے غلط فہمی دور کرادی۔ اریب نے مجتبیٰ حسین کو گلے لگایا اور انہیں رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری کا جانشین قرار دیا۔ آپریشن کے سلسلے میں اریب کو دواخانہ میں شریک کیا گیا تو کرشن چندر، راج بہادر گوڑ کے ہمارہ مجتبیٰ حسین نے ان کی عیادت کی۔ اپنے

دوسرے مجموعہ کو دکھایا تو اریب نے مسکراہٹ کا اظہار کیا۔ یہ اریب کی آخری کا مسکراہٹ تھی۔ خاکے میں مجتبیٰ حسین کا پر لطف انداز بیان جان ڈال دیتا ہے۔ اور قاری اسلوب کی چاشنی کی بدولت مکمل تحریر پڑھنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر لیتا ہے۔ یہی مجتبیٰ حسین کی بڑی خوبی ہے۔

**مرکزی خیال:** ''سلیمان اریب'' خاکہ میں مجتبیٰ حسین نے اپنے دوست اور حیدرآباد کے مشہور شاعر سلیمان اریب کی یادوں کو پیش کیا۔ اس خاکے سے حیدرآباد کے ادبی ماحول کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اور قاری کے ذہن میں سلیمان اریب کی شخصیت کا ایک بھرپور خاکہ بیٹھ جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے مزاحیہ طرزِ بیان سے خاکہ میں جان ڈال دی۔

## افسانہ **درد کے خیمے** از پروفیسر بیگ احساس

**سوال: پروفیسر بیگ احساس کا تعارف بیان کیجئے۔**

**جواب:** پروفیسر بیگ احساس کا تعارف: محمد بیگ پروفیسر بیگ احساس کے نام سے مشہور ہیں۔ ضلع نظام آباد سے تعلق رکھنے والے اردو کے نامور افسانہ نگار، محقق اور نقاد ہیں۔ 10 اگسٹ 1948ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی ملازمت اور کچھ عرصہ صحافت سے وابستہ رہنے کے بعد یونیورسٹی آف حیدرآباد سے ''کرشن چندر شخصیت اور فن'' موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو لیکچرر کے عہدے پر فائز ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کے عہدے تک پہونچے۔ بعد میں یونیورسٹی آف حیدرآباد میں پروفیسر اور صدر شعبہ اردو رہے۔ اپنے تخلیقی سفر کے دوران ان کی کتابیں خوشہ گندم (افسانوی مجموعہ 1979)، حنظل (افسانوی مجموعہ 1993)، کرشن چندر شخصیت اور فن (تحقیق 1999)، شور جہاں (تنقیدی مضامین 2005ء)، ہزار مشعل بکف ستارے (2005ء) درد کے خیمے (افسانوی مجموعہ 2009ء) مرزا غالب (تعلیم بالغان 2004ء)، بوجھ کیوں بنوں (تعلیم بالغان 2004ء) اور شاذ تمکنت (مونوگراف 2010ء) شائع ہوئیں۔ ان کے افسانوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی ہوا۔ انہیں 2009ء میں ساہتیہ اکیڈیمی ایوارڈ، بیسٹ ٹیچر ایوارڈ اور ان کی کتابوں پر اردو اکیڈیمی اے پی کی جانب سے پانچ ایوارڈ ملے۔ وہ رسالہ سب رس کے مدیر ہیں۔ اور ملک کی ادبی ولسانی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔ مختلف ادبی اجلاسوں اور سمیناروں میں شرکت کے لئے ملک و بیرون ملک کی جامعات اور اداروں کا دورہ کیا۔ ان کے افسانے اپنے عہد کے مسائل اور زندگی کی ناہمواریوں کے عکاس ہیں۔ انہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اور بڑی فنکاری کے ساتھ اپنی بات کو پیش کرتے ہیں۔ افسانہ درد کے خیمے میں پروفیسر بیگ احساس نے ہجرت کے کرب کے واقعات کو فنکاری کے ساتھ پیش کیا۔

**سوال: افسانے کی تعریف کیجئے اور اس کے اجزائے ترکیبی بیان کیجئے۔**

**جواب:** افسانہ اردو نثر کی ایک قسم ہے۔ اسے مختصر کہانی بھی کہتے ہیں۔ ایسا قصہ یا کہانی جس میں زندگی کے کسی ایک پہلو کو اہمیت دی گئی ہو اور وہ اس قدر مختصر ہو کہ ایک نشست میں پڑھا جا سکتا ہو اسے افسانہ کہتے ہیں۔ افسانے میں کسی ایک پہلو کو ہی اہمیت دی جاتی ہے۔ افسانے میں کہانی، کردار، مکالمے، منظر، زماں و مکاں اور وحدت تاثر اجزا ہوتے ہیں۔ پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ اردو کے مشہور افسانہ نگار گذرے ہیں۔

# افسانہ درد کے خیمے

از: پروفیسر بیگ احساس

جیسے ہی پلین نے لینڈ کی میں نے بے ساختہ گھڑی پر نظر ڈالی۔صرف ڈیڑھ گھنٹے کا سفر۔ ڈیڑھ گھنٹے کا یہ فاصلہ میں نے پورے تیس سال میں طے کیا۔ضروری اُمور کی تکمیل کے بعد سب نے منتظر چہرے تلاش کر لئے اور تیزی سے روانہ ہوگئے تھے۔ میں وقت کی جس منزل پر رُکا اس چہرے کو تلاش کر رہا تھا وقت اس سے کہیں آگے بڑھ گیا تھا۔ کھچڑی داڑھی والے شخص کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی۔ جس کی آنکھیں بے چین سی تھیں۔ میرے وجود میں اشارے وصول ہونے لگے میں آگے بڑھا تو اس شخص نے میرا نام پوچھا اور میرا نام پوچھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔اس کے پورے بدن میں لرزش تھی۔ میرے اندر درد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔اس درد نے مجھے یقین دلایا کہ یہی میرے بہنوئی اور بھانجی ہیں۔''تصویروں کے سہارے پہچاننا کتنا مشکل ہوجاتا ہے تم نے آنے میں بہت دیر کردی''۔ بہنوائی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔''پاپا کی نظر بہت کمزور ہوگئی ہے۔ شوگر بہت بڑھی ہوئی رہتی ہے۔انسولین کے انجکشن لگتے ہیں''۔ میری بھانجی نے کارڈرائیو کرتے ہوئے بتایا۔''آپ کی آمد کی اطلاع ملی تو بے چین ہوگئے کئی راتوں سے ٹھیک سے سوئے بھی نہیں۔آج بہت سویرے سے تیاری کی۔ہم وقت سے بہت پہلے ایرپورٹ آگئے''۔ بھانجی نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن بہنوئی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں اس چہرے سے تہیں ہٹانے کی کوشش کرنے لگا جس کے نیچے میرے تصور والا چہرہ چھپا تھا۔ پتہ نہیں وہ چہرہ کہاں کھو گیا تھا۔اس چہرے پر بہتے آنسوؤں نے میرے وجود کے اندر لگے Rewind کے بٹن کو دبا دیا۔کئی منظر تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑنے لگے۔آنسوؤں سے تر چہرے پر منظر رُکا۔اس چہرے پر شدید بے بسی تھی۔ٹرین کے ڈبے سے جھانکتا ہوا وہ چہرہ میری بہن کا تھا۔ٹرین پٹریوں پر رینگتی چلی گئی۔ پھر ایک نقطہ بن کر فضاء میں کھو گئی۔ میں نے اپنی بہن کو پھر نہیں دیکھا۔

''تمہارا بھائی آیا ہے'' میرے بہنوائی ایک قبر سے مخاطب تھے۔ میرے سامنے ایک قبر تھی۔قبر کے کتبے پر میری بہن کا نام لکھا تھا قبرستان سے باہر آئے تو بہنوائی اور بھانجی مسلسل رو رہے تھے۔غم سے نڈھال میں بھی خاموشی سے آنسو بہاتا رہا۔گھر پہونچے تو بچے بے چین تھے۔قمیص شلوار پہنے نوجوان قدرے توند نکلی ہوئی۔سر پر نسبتاً کم بال۔''تمہارا ماموں'' میرے بہنوائی نے مجھے پیش کیا۔بچوں کی آنکھوں میں حیرت تھی۔''اور تمہارے نانا'' بھانجی نے اپنے بچوں سے کہا۔''دھت نانا ایسے تھوڑے ہوتے ہیں۔'' چھوٹے لڑکے نے کہا۔سب ہنس دئے۔ ماحول کا تناؤ ٹوٹا۔ بھانجی کا شوہر بھی آ گیا۔ بہنوائی نے مجھ سے ایک ایک رشتے دار کے بارے میں پوچھنے لگے۔''ہماری جب شادی ہوئی تھی۔تمہارا یہ ماموں بہت چھوٹا تھا۔ میں اسے گود میں اُٹھائے بازار میں گھومنے جاتا۔کوئی راستہ چلنے والا اس کے گال چھو لیتا تو میں ان لوگوں کو ڈانٹ دیتا۔ بہت خوبصورت تھا یہ'' بچے ہنسنے لگے میں جھینپ گیا۔میرا بست بہنوائی کے کمرے میں لگا دیا گیا۔میرے بہنوائی کے وجود میں جذبات کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔تیس برس سے رُکا ہوا طوفان تھا۔ جو کنارے توڑ کر دور تک پھیلنے کیلئے بے چین تھا۔''ہم یہاں آنا ہی نہیں چاہتے تھے۔تمہارے ابا نے ہمیں زبردستی بھیج دیا تھا''۔ پتہ نہیں کتنے برسوں سے یہ شکایت ان پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔ وہ بوجھ سے آزاد ہوگئے۔''ہم اس زمین کے ہو ہی نہیں سکے۔ مجھے ذرا سا بھی سہارا مل جاتا تو کبھی نہ آتا''۔ وہ اور بھی کچھ کہہ رہے تھے۔لیکن میں بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف جا رہا تھا۔

اب میں چھوٹا سا سات برس کا لڑکا ہوں۔گھر کا عجیب سا ماحول ہے۔امی کی آنکھیں سرخ رہتی ہیں۔ابا بھی چپ چپ رہتے ہیں۔اس فضا نے ہمیں سہما دیا تھا۔۔بہن کا سامان باندھ دیا گیا۔ابا اور ماموں بھی تیار ہیں۔بہن امی سے الگ ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ابا بار بار کہہ رہے تھے'' اب چلو بیٹا ٹرین کا وقت ہو رہا ہے''۔ لہجے میں غصہ نہیں بے بسی تھی۔ میری ننھی سی بھانجی میری کسی بہن کی گود میں دبکی بیٹھی ہے۔ بہنوائی کا چہرہ سخت پتھر جیسا ہے۔ ماموں نے بڑی مشکل سے بہن کو الگ کیا۔انہیں رکشہ پر سوار کر دیا گیا۔اور دوسری بہنیں دروازے تک آ کر رُک گئیں۔ایک کہرام

اُٹھا جیسے گھر سے کوئی میت جارہی ہو۔ ہم اپنی بہن کو اسی روز رو لئے۔ ابا اور ماموں دوسرے رکشے میں بیٹھ گئے۔ ماموں نے مجھے بھی گود میں بٹھالیا۔ ٹرین آ گئی بہن ٹرین میں سوار ہونے کے لئے تیار نہیں ہورہی تھیں۔ ماموں نے بہن کو ٹرین میں سوار کروایا۔ ''تم لوگ پہونچو میں بھی تمہارے پیچھے آرہا ہوں''۔ ماموں بھی بے روزگار تھے۔ ''ہاں ہم سب وہاں آجائیں گے بیٹا'' ابا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ٹرین نے سیٹی دی تو بہن نے اچانک مجھے بھینچ لیا۔ اور بے تحاشہ پیار کرنے لگیں۔ میرے اندر کچھ پگھلنے لگا۔ اور میں چیخ چیخ کر رونے لگا۔ ٹرین چلنے لگی تو ماموں نے مجھے ان کی گود سے لے لیا۔ وہ چہرہ' چہرہ میں اسے بھول ہی نہیں سکا۔ پورے دھندلے منظر میں وہ ایک ہی چہرہ فوکس میں تھا۔ شارپ!! پھر سب کچھ آؤٹ آف فوکس ہوگیا۔

''تم نہیں جانتے۔ غیر قانونی طریقے سے سرحد پار کرنا کتنا مشکل کام تھا۔ اس سرزمین پر پہونچے تو ملازمت تیار تھی۔ نہ ماموں آئے نہ تم لوگ!!''

ابا صبح واکنگ کے بعد لوٹے تو سینے میں درد کی شکایت کی۔ دواخانے میں شریک ہوئے۔ دو روز بعد لوگ ایمبولینس میں ابا کا بے جان جسم گھر لے آئے۔ تین بہنیں ان بیاہی اور میں؟ جس نے دروازے پر پہلے دستک دی امی نے بہنوں کو بیاہ دیا۔ یہاں آنے کے لئے حالات سازگار ہوئے تو بتیس برس گذر گئے تھے۔

جب تمہارے ابا کا انتقال ہوا تھا تمہاری بہن تڑپ کر رہ گئیں۔ تمہاری بہنوں کی شادیاں ہوئیں وہ ترستی رہیں کہ کوئی انہیں لینے کے لئے آئے۔ کاش تم ہی آجاتے۔ وہاں دوبارہ جانے کی حسرت میں وہ چلی گئیں''۔ ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ ایک سناٹا سا چھا گیا۔ مجھے ایک جرم کا سا احساس ہوا۔ لیکن ہم دونوں ہی اچھی طرح جانتے تھے کہ کون کتنا مجبور تھا۔ ''چھوڑو'' مجھے اداس دیکھ کر بہنوائی نے کہا۔ ''تم آئے ہو تو ساری باتیں یاد آگئیں'' ایک عجیب سے خالی پن اور بے معنویت کا احساس جاگا۔

دن بھر ہم شہر کے خوبصورت مقامات دیکھتے۔ لوگوں سے ملتے۔ بچوں کو اپنے اس شہر پر بڑا فخر تھا۔ سمندر کے کنارے بسا یہ شہر تھا بھی خوبصورت۔ رات ہوتے ہی بہنوائی میرا ہاتھ پکڑ کر ماضی کے اس شہر میں لے چلتے۔ جو ایک ایسی ریاست کا دارالخلافہ تھا۔ جس کا رقبہ ٹلی کے برابر تھا۔ جس کی آب وہوا بحیرہ روم جیسی تھی۔ پہاڑیوں سے گھرا باغوں اور جھیلوں کا شہر جس کی بنیاد محبّ کی یادگار تھی۔ جس کی ہواؤں میں مستی تھی۔ اتنی مستی کہ آدمی پر نشہ طاری رہتا۔ مخصوص بولی' مخصوص تہذیب' ان کا اپنا بادشاہ تھا۔ جس کو اعلیٰ حضرت' حضور' فاتح دوراں' نوشیرواں زماں' امیرالمومنین وغیرہ القاب سے بلاتے۔ اس پر جان چھڑکتے۔ ان کی اپنی جامعہ' اپنی ریل' اپنا سکہ' اپنا ٹپہ' اپنی فیکٹریاں' لوہے' کوئلے اور سونے کی کانیں تھیں۔ سمنٹ کی پختہ سڑکیں اور خوبصورت عمارتیں تھیں۔ دور دور سے تاجر یہاں آکر آباد ہوگئے تھے۔ اہل علم کی قدر افزائی ہوتی تھی۔ ملازمتوں کے حصول کے لئے لوگ آتے تو یہیں کے ہوکر رہ جاتے۔ اس شہر کا سینہ بے حد فراخ تھا۔ اس شہر سے نکل کر میں نے اپنے بہنوائی سے پوچھا کہ ''پھر وہ شہر کیسے گم ہوگیا'' اتنا وقت گذر جانے کے بعد اب سب کچھ صاف صاف نظر آرہا ہے۔ وقت کو پہچاننے میں غلطی ہوئی تھی۔ اس رہنما کے سر میں ایک ہی سودا تھا کہ اس مملکت کو آزاد رہنا ہے۔ پھر تو انتہا پسند انقلابی لیڈر کی آواز بادشاہ کی آواز سے اونچی ہوگئی۔ لوگ اس کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ سیاست کی جگہ جذبات نے لے لی۔ حکومت کی جگہ جوشیلی تقریریں آگئیں۔ سیاسی لڑائی کو مذہبی رنگ دیا گیا۔ نیم فوجی دستے بنے۔ نوجوانوں کو خدا' مذہب اور قرآن کے نام پر قربانی کے لئے تیار کیا گیا۔ ریڈیو سے حب الوطنی کے گیت بجائے جانے لگے۔ جب وقت آیا تو نیم فوجی دستے لڑنے نکلے۔ شاہ کے نام کے نعرے بلند ہوئے۔ جیالے نوجوان ٹینکروں کے سامنے لیٹ گئے۔ بادشاہ کا فوجی کمانڈر اپنی

فوج کے ساتھ تماشہ دیکھتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تیس ہزار لاشوں کو عبور کر کے وہ لوگ آ گئے۔ ایک شرم ناک شکست! سب ختم ہو گیا۔ بلند بانگ دعوؤں کے ردعمل کے خوف سے ماں باپ نے اپنی بیٹیوں کو کنویں میں چھلانگ لگانے اور زہر کھانے پر مجبور کر دیا۔ فوجی کمانڈر نے آگے بڑھ کر فاتحین کا استقبال کیا۔ قربانیاں رائیگاں گئیں۔ بادشاہ وقت نے انہیں غدار قرار دیا۔ آزاد مملکت کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ خوف و ہراس کے اس ماحول میں ترکی ٹوپیاں چھپا دی گئیں۔ بعض افراد نے گھبرا کر گاندھی کیپ اوڑھ لی۔ جسے ایک مضبوط قلعہ سمجھا جا رہا تھا۔ وہ ہوا کے ایک ہی جھونکے میں زمین بوس ہو گیا۔ پرندے گرے ہوئے درختوں پر بسیرا نہیں کرتے وہ سب پھڑ پھڑا کر ایک سمت بھاگے۔ اس بھاگ دوڑ کے بعد پتہ چلا نہ اینٹوں کی بھٹی ہے نہ ریت ہے نہ سمنٹ کے بورے نہ ٹرکس ہیں اور نہ مزدور نہ چٹیل میدان تھا۔ جہاں بیروزگاری کا بھوت منہ کھولے کھڑا تھا۔ دوبارہ ٹھیکے داری کا سوال ہی نہ تھا۔ تینوں سمتوں میں اندھیرا ہی تھا۔ ہمیں بھی اسی سمت ڈھکیل دیا گیا۔ میں سوچتا ہوں مجھے تھوڑا وقت اور مل جاتا تو یہاں کبھی نہ آتا۔ دیکھو تم تو اپنی زمین سے جڑے ہوئے ہونا۔ ہجرت کا کرب تو نہیں سہا۔ ہجرت وہی اچھی لگتی ہے جب فاتح دبے پاؤں اپنی زمینوں پر واپس آ جائیں۔'' میں چپ رہا۔ ہم نے تو اپنے شہروں میں ہجرت کا کرب سہہ لیا۔ وہ تہذیب سمٹ کر چند محلوں میں رہ گئی۔ فصیل بند شہر کے دروازوں اور دیواروں کو توڑ کر شہر دور دور تک پھیل گیا۔ سرخ مٹی کو سیاہ مٹی سے جدا کر دیا گیا۔ غذائیں بدل گئیں۔ لباس بدل گئے۔ سڑکوں اور گلیوں کے اجنبی نام رکھ دئے گئے۔ وہ جھیل جو کسی بزرگ کے نام سے موسوم ہے وہاں ایک بت نصب کر دیا گیا۔ وہاں مورتیاں ڈبوئی جاتی ہیں۔ وہ پہاڑ جہاں نوبت بجائی جاتی تھی وہاں مندر کی گھنٹیاں بجتی ہیں۔ لوگوں کا ایک ریلا یہاں آ کر بس گیا۔ انہوں نے اپنی اپنی بستیاں اس شان سے بسالیں کہ ہم سمٹ کر گندہ بستیوں میں آ گئے ہیں۔ شہر کا بدنما حصہ جسے کوئی نہیں پوچھتا۔ نئی نئی عمارتیں زمین کے سینے میں پیوست کی جا رہی ہیں۔ اب شہر کی انفرادیت باقی نہیں رہی۔ دوسرے شہروں جیسا ہو گیا۔ سڑکیں دیوار اور صحنوں میں اتر آئی ہیں۔ شہر خوبصورت ہو گیا ہے۔ لیکن عام شہروں جیسا ہو گیا ہے سمنٹ کا جنگل۔ شاہ کا نام بعض عمارتوں نے باقی رکھا ہے۔ اور بس۔ اب فسادات کم ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں خوف و ہراس اور احساس کم تری میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ ساری قوم کی پیشانی پر دہشت گردی کا نشان داغ دیا گیا ہے۔ تمہاری زمین کا سایہ ہمارے سروں پر منڈلاتا رہتا ہے۔ لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔ ''ہاں ہمیں تحریر و تقریر کی آزادی ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر اذانیں بھی گونجتی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں گولیاں بہت چلتی ہیں۔ جن تیس ہزار لاشوں کو ہم نے ایک بڑا حادثہ سمجھا تھا وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ یہاں تو لاشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ نوجوان آسائیشوں کی تلاش میں دور دور تک چلے گئے ہیں۔ سینکڑوں میل دور بیٹھے وہ اپنے وطن میں موجود ماں باپ کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ عورتیں کچھ تو اپنے شوہروں کے پاس چلی گئیں اور جو یہاں رہ گئیں وہ رات رات بھر ٹی وی کے سامنے بیٹھتی ہیں اور صبح دیر سے جاگتی ہیں۔ مرغن غذائیں کھا کھا کر موٹی ہوتی جا رہی ہیں۔ پھر جم (Jim) چلی جاتی ہیں۔ پتہ نہیں یہ سب کیا ہو رہا ہے''۔ بہنوائی نے کہا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

بچے بہت جلد گھل مل گئے۔ انہیں اپنی برتری جتانے کا شوق تھا۔ جس کرب سے میرے بہنوائی گذر رہے تھے بچے اس کا شکار نہیں ہوئے۔ انہیں اپنی تہذیب پر اور کلچر پر فخر تھا۔ بزرگ انہیں ماضی کا مسخ شدہ چہرہ سونپنے کی کوشش میں ہانپ رہے تھے۔ نوجوانوں میں ایک جوش تھا ایک جذباتیت تھی۔ وہی جذباتیت جو زمین کے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ وہ بربریت کے خوفناک منظر میں جی رہے تھے۔ موقع ملتے ہیں دولت کی تلاش میں نکل پڑے۔

ویزا ختم ہو گیا۔ میں نے توسیع نہیں لی۔ میرا وجود بہنوائی کو حکومت کی آنکھوں میں مشتبہ بنا سکتا ہے۔ میں نے یہی محسوس کیا۔ فضا صاف

نہیں تھی۔ جانے کا وقت آ گیا۔ اس بار بچے بھی لپٹ کر روئے۔ بہنوائی نے وعدہ کیا کہ مرنے سے قبل وہ ایک بار سارے بچوں کے ساتھ آئیں گے۔ تمام رشتہ داروں سے ملوائیں گے۔ ایر پورٹ جاتے ہوئے قبرستان پر پھر کار رکی۔ ہم بہن کی قبر کے پاس پہونچے۔ بہنوائی نے کہا۔ ''دیکھو تمہارا بھائی جا رہا ہے۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں بھر قبر سے لپٹ گیا۔ پلین اپنی رفتار سے چل رہا تھا۔ لیکن میں اب بھی وہیں تھا۔ میرے وجود میں قبر کی خوش بو بس گئی تھی۔ پتہ نہیں کب ملاقات ہو۔ خوبصورت شہر کی مخصوص بساند نے احساس دلایا کہ میں اپنی زمین پر واپس آ گیا ہوں۔ ایر پورٹ سے ہوٹل آیا۔ بہنوائی کو فون لگایا کہ بخیر وہ خوبی پہونچنے کی اطلاع دوں۔ بہنوائی نے فون اٹھایا۔ میں نے پہونچنے کی اطلاع دی۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''ایر پورٹ سے واپسی پر ہم پھر قبرستان گئے۔ دل بھر آیا تھا۔ تمہاری بہن کی قبر سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا۔ لیکن سنو! تم سن رہے ہونا؟ تمہاری بہن کی قبر کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ ہم نے قبرستان کا چپہ چپہ چھان مارا۔ تمہاری بہن کی قبر کہیں نہیں!

**سوال: افسانہ ''درد کے خیمے'' کا خلاصہ لکھو۔**

**جواب:** افسانہ ''درد کے خیمے'' حیدرآباد کے نامور افسانہ نگار پروفیسر بیگ احساس نے لکھا ہے۔ اس افسانے میں ہجرت کے کرب کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانے کا خلاصہ اس طرح ہے۔

**خلاصہ افسانہ:** افسانہ ''درد کے خیمے'' میں پروفیسر بیگ احساس نے حیدرآباد سے پاکستان ہجرت کر جانے والے ایک خاندان کا حال بیان کیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ملک کے بعد پاکستان کا وجود عمل میں آیا تھا۔ اس وقت ہونے والے دنگے فسادات کو دیکھ کر کچھ مسلمانوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ ہندوستان ان کے لئے غیر محفوظ ہوگا اور اپنا ملک پاکستان ان کے خوابوں کی جنت ہوگا۔ چنانچہ اس خیال کے ساتھ بہت سے مسلمان پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ لیکن یہ تعداد بہت کم تھی اور بڑی تعداد میں مسلمان ہندوستان کو ہی اپنا وطن مان کر یہیں رہ گئے۔ جو لوگ پاکستان ہجرت کر گئے تھے ان کے افراد خاندان ہندوستان میں ہی رہ گئے تھے۔ ایسے ہی ایک خاندان کی کہانی افسانہ ''درد کے خیمے'' میں پیش کی گئی ہے۔ حیدرآباد سے کراچی پاکستان ہجرت کر جانے والے خاندان کی خاتون اپنے والدین اور بھائی بہنوں کو یاد کرتی رہتی ہے لیکن دو ممالک کے حالات کے پیش نظر یہ لوگ ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔ آخر کار خاتون کا انتقال ہو جاتا ہے۔ جب یہ خبر ہندوستان میں حیدرآباد میں مقیم اس خاتون کے بھائی کو دی جاتی ہے تو وہ اپنے بہنوائی اور ان کے بچوں سے ملاقات کے لئے ذریعے ہوائی جہاز کراچی روانہ ہوتا ہے۔ جب اس کی بہن نے ہجرت کی تھی تو وہ بہت چھوٹا تھا۔ اس کے والدین کے انتقال کے بعد اس کے دیگر بھائی بہنوں کی پرورش اور ان کی شادی بیاہ اسی کی نگرانی میں ہوئی تھی یہی سبب ہے کہ وہ پڑوسی ملک میں موجود اپنی بہن اور ان کے بچوں سے ملنے نہیں جا سکا تھا۔ ایر پورٹ پر اس کی بھانجی اور بہنوائی اس کا استقبال کرتے ہیں۔ بچے اپنے ماموں کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔ اور بھانجی اور اس کے بہنوائی اسے سارے حالات سناتے ہیں۔ یہ لوگ قبرستان جا کر بہن کی قبر کی زیارت کرتے ہیں۔ اور آپس میں مل کر غم کا اظہار کرتے ہیں۔ بھائی دوران قیام حیدرآباد کے حالات اور حیدرآباد کی ترقی اور اپنے گھر کے حالات سناتا ہے۔ بہنوائی کہتے ہیں کہ کراچی میں انہیں ایک عرصہ گذارنے کے باوجود مہاجر ہی کہا جاتا ہے اور زندگی میں انہیں ترقی کے مواقع کم دستیاب ہیں۔ ہندوستان میں اچھی ترقی ہوئی جب کہ یہاں آپسی جھگڑے زیادہ ہیں۔ پندرہ دن گذرنے کے بعد بھائی وطن واپسی کے لئے نکلتا ہے۔ واپسی میں ایک مرتبہ پھر قبرستان جا کر بہن کی قبر کی زیارت کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بہن بھی اس کے ساتھ اپنے وطن واپس چلنے کے لئے بے چین ہے۔ جب وہ حیدرآباد آ کر اپنے خیریت سے پہونچنے کی اطلاع دیتا ہے تو بہنوائی ایک عجیب اطلاع دیتے ہیں کہ واپسی میں وہ لوگ ایک مرتبہ پھر قبرستان گئے تھے لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ قبرستان میں ان کی بہن کی قبر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ شائد ان کی قبر کی مٹی

اپنے بھائی کے ساتھ اپنے وطن واپس چلی گئی ہو۔

**مرکزی خیال:** افسانہ ''درد کے خیمے'' کے ذریعے پروفیسر بیگ احساس نے وطن کی یاد کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے کہ ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلی جانے والی خاتون کا جب انتقال ہوتا ہے تو اس کی روح کو چین اور قرار نہیں آتا جب ہندوستان سے اس کا بھائی اس کی قبر کی زیارت کو آتا ہے تو بھائی کے ساتھ اس کی قبر کی مٹی بھی اپنے وطن واپس چلی آتی ہے۔ وطن سے بے حد محبت کا احساس اس افسانے کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے۔

سوال: غالبؔ کا تعارف بیان کیجئے۔

جواب: مرزا غالبؔ کا تعارف: مرزا اسد اللہ خان غالب (1796-1869) اردو غزل کے نامور شاعر گذرے ہیں۔ اکبر آباد آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد عبداللہ بیگ خاں فوج میں ملازم تھے۔ غالبؔ کے آبا و اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا۔ لیکن غالبؔ نے قلم سے تلوار کا کام لیا۔ غالب بچپن میں ہی یتیم ہو گئے۔ چچا نصر اللہ بیگ خان نے ان کی پرورش کی۔ غالبؔ نے آگرہ کے قیام کے زمانے سے ہی شاعری شروع کر دی تھی اور میرؔ نے ان کے ابتدائی کلام کی تعریف بھی کی تھی۔ قلعہ دہلی سے وابستہ رہے۔ استاد ذوقؔ کے انتقال کے بعد بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے اور ان کی حکومت کی جانب سے پذیرائی بھی ہوئی۔

غالبؔ نے اردو غزل گوئی میں اپنا الگ مقام بنایا وہ دوسروں کی راہ پر چلنے سے کتراتے تھے۔ ابتداء میں فارسی میں شاعری کرتے رہے۔ بعد میں اردو شاعری کی۔ غالب کا اردو دیوان مختصر ہے۔ لیکن اسے عالمی طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ موضوعات اور انداز بیان میں جدت' شوخی' ظرافت اور دیگر زبان و بیان کی خوبیاں انہیں اردو کا ایک منفرد شاعر بناتی ہیں۔ غالبؔ کا انتقال 1861ء میں دہلی میں ہوا۔

سوال: غالبؔ کی غزل کا مطلع اور مقطع لکھئے۔

جواب: غالبؔ کی غزل کا مطلع

کوئی دن گر زندگانی اور ہے　　اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

غالبؔ کی غزل کا مقطع

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام　　ایک مرگ ناگہانی اور ہے

سوال: حالیؔ کا تعارف بیان کیجئے۔

جواب:: **خواجہ الطاف حسین حالیؔ** (1837-1914) اُردو کے مشہور شاعر' انشا پرداز سوانح نگار اور نقاد گذرے ہیں۔ غالبؔ کے شاگرد تھے اور سرسید کی اصلاحی تحریک میں حصہ لیا' ابتداء میں قدیم طرز کی غزل گوئی کی۔ بعد میں ادب کی مقصدیت کے قائل ہوئے انہوں نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں نظمیں سناتے ہوئے نظم گوئی کو فروغ دیا۔ مشہور مسدس مدوجزر اسلام 1879ء میں لکھی۔ سوانح نگاری میں آپ کی یادگار کتابیں حیات سعدی ء یادگار غالب 1897 اور حیات جاوید 1901ء مشہور ہیں۔ اپنی شاعری کے مجموعہ کو ایک طویل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا جس میں شاعری کے بارے میں اُصولی بحثیں کی گئیں۔ بعد میں یہ کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' کے عنوان سے 1893ء میں علٰحدہ شائع ہوئی اور اس کتاب کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ حالیؔ ''جدید اُردو تنقید کے بانی'' قرار پائے۔ ان کی مثنویاں حب وطن' مناجات بیوہ اور چپ کی داد مشہور ہیں۔ حالیؔ کا انتقال ۱۹۱۴ء ہوا۔

سوال: حالیؔ کی غزل کا مطلع اور مقطع لکھئے۔

جواب: حالیؔ کی غزل کا مطلع

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں  رخنے نکلیں گے سینکڑوں اس میں

حالؔی کی غزل کا مقطع

کی ہے خلوت پسند حالی نے  اب نہ دیکھو اس کو مجلس میں

سوال: مخدوم کا تعارف بیان کیجئے۔

جواب: مخدوم محی الدین اردو زبان کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بائیں بازو کے نامور رہنما بھی تھے۔ مخدوم 4 فروری 1908ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک کٹر مذہبی خانوادے سے تھا۔ ان کے دادا حیدر آباد دکن کی تاریخی مکّہ مسجد میں قاری تھے۔ والد غوث محی الدین بھی مذہبی ادارے سے وابستہ تھے اور ان کی رہائش بھی مسجد ہی میں تھی۔ پیدائشی طور پر ان کا گھرانہ بے حد غریب تھا، اپنے آس پاس غربت اور استحصال کا دور دورہ دیکھ کر وہ بائیں بازو کے نظریات سے متاثر ہو گئے اور زندگی بھر جدو جہد میں رہے۔ مخدوم خالصتاً مزدور طبقہ کے شاعر اور ہمنوا تھے۔ عملی سیاست میں آنے کے بعد بھی انہوں نے اہل اقتدار سے لے کر رکشہ والے تک، ہر کسی سے تعلق رکھا۔ انہوں نے حیدر آباد دکن میں جاگیرداری نظام کے خلاف لڑتے ہوئے وہاں کے عام کسانوں کی قیادت کی اور باقاعدہ مسلح جدو جہد کی۔ 25 اگست 1969ء کو جب وہ حیدر آباد سے ایک میٹنگ میں شرکت کرنے دہلی آئے ہوئے تھے، ان کا انتقال ہو گیا۔ انہیں حیدر آباد دکن میں قبرستان شاہ خموش میں دفن کیا گیا۔ ان کے لوح مزار پر یہ شعر کندہ ہے؛

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا  سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

**شعری سفر:** ان کا شعری سفر 35 سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ مخدوم ایک زود گو شاعر نہیں تھے۔ تاہم مختلف وقفوں سے ان کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے۔ سرخ سویرا، گل تر اور بساط رقص۔ مخدوم نے زیادہ تر نظم کی صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔

سوال: مخدوم کی غزل کا مطلع اور مقطع لکھو۔

جواب: مخدوم کی غزل کا مطلع

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر  چشم نم مسکراتی رہی رات بھر

مخدوم کی غزل کا مقطع

کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا  کوئی آواز آتی رہی رات بھر

سوال: جمیل نظام آبادی کا تعارف لکھو۔

جواب: محمد عبدالباری نام اور جمیلؔ تخلص ہے۔ اپنے شہر نظام آباد کی مناسبت سے جمیلؔ نظام آبادی قلمی نام اختیار کیا۔ اور اسی نام سے شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ یکم جنوری 1949ء کو نظام آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام جناب شیخ احمد ہے۔ میسور یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ 1973ء سے ایک اردو ہفتہ وار اخبار گونج کے نام سے جاری کیا۔ جو آگے چل کر ایک ادبی ماہنامے میں تبدیل ہو گیا۔ 1980ء سے ریاستی اردو اکیڈیمی کے ریجنل آفس نظام آباد پر مینجر کی حیثیت سے کارگذار ہیں۔ 1970ء سے شعر کہہ رہے ہیں۔ غزل محبوب صنف سخن ہے۔ نظمیں ثلاثیاں، حمد اور نعت بھی کہی ہیں۔ جمیلؔ نظام آبادی کا پہلا شعری مجموعہ ''سلگتے خواب'' کے عنوان سے 1978ء میں شائع ہوا۔ پھر ''تجدید آرزو 1985ء۔ صبر جمیل 1993ء۔ دل کی زمین 2004ء اور ''سب سخن میرے 2010ء میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ 2007ء میں نثری مضامین کا مجموعہ ''حرف جمیل'' کے نام سے شائع ہوا۔ دکن کے 155 شعراء اور قلمکاروں کی تصاویر اور تعارف پر مبنی ''گونج ادبی البم'' کے نام سے شائع کیا۔ جسے

ایک دستاویزی اہمیت حاصل ہے۔ایک اور مجموعہ کلام ''شہرِ سخن'' کے نام سے زیرِ طباعت ہے۔

سوال: جمیلؔ نظام آبادی کی غزل کا مطلع اور مقطع لکھئے۔

جواب: جمیلؔ نظام آبادی کی غزل کا مطلع

جواب: تجھ سے جب پڑ ہی گیا ہے واسطہ اے زندگی
میں تجھے بننے نہ دوں گا مسئلہ اے زندگی

جمیلؔ نظام آبادی کی غزل کا مقطع

تیرے ملنے سے جمیلؔ خستہ جاں کیوں خوش رہے
جانتا ہوں جب کہ تو ہے بے وفا اے زندگی

## اردو معروضی سوال جواب برائے ڈگری سال اول زبان دوم اردو مضمون معہ ماڈل پیپر

## انٹرنل امتحانات بی اے، بی کام، بی ایس سی، سال اول سمسٹر دوم

۱) ۔۔۔۔۔۔۔۔ اردو شاعری کی مقبول صنف ہے۔(غزل)

۲) غزل کے لغوی معنیٰ ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہیں۔(عورتوں سے باتیں کرنا)

۳) ۔۔۔۔۔۔۔۔ کو کوزے میں سمندر بند کرنے کا فن کہتے ہیں۔(غزل)

۴) غزل کے پہلے شعر کو۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔(مطلع)

۵) غزل کے اشعار میں استعمال ہونے والے ہم وزن الفاظ کو۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔(قافیے)

۶) قافیوں سے غزل میں ۔۔۔۔۔۔۔۔ پیدا ہوتا ہے۔(ترنم)

۷) غزل کے اشعار میں شعر کے ختم پر استعمال ہونے والے مسلسل الفاظ کو۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔(ردیف)

۸) ذیل کے شعر میں قافیہ اور ردیف کی نشاندہی کیجئے۔

۹) کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

۱۰) (زندگانی۔ٹھانی۔قافیے۔اور ہے۔ردیف)

۱۱) غزل کے اشعار کی تعداد۔۔۔۔۔۔۔۔ ہوتی ہے۔(کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ اکیس)

۱۲) غزل کے اچھے شعر کو۔۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔(شاہ بیت۔حاصل غزل شعر)

۱۳) غزل کے آخری شعر کو۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔(مقطع)

۱۴) غزل کے آخری شعر میں شاعر۔۔۔۔۔۔۔۔ استعمال کرتا ہے۔(تخلص)

۱۵) لفظ مطلع۔۔۔۔۔۔۔۔ سے بنا ہے۔(لفظ طلوع سے)

۱۶) غزل میں شاعر اپنی بات کو دو یا اس سے ذائد اشعار میں کہے تو اسے ۔۔۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔(قطعہ)

۱۷) تخلص کی نشانی ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔( )

۱۸) غزل میں وزن ۔۔۔۔۔ کے رعایت سے پیدا ہوتا ہے۔(بحر)

۱۹) غزل میں ۔۔۔۔۔ کے ذریعے دو یا ذائد اشعار میں بات مکمل کی جاتی ہے۔(قطعہ)

۲۰) مرزا اسداللہ خان کا تخلص ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(غالبؔ)

۲۱) الطاف حسین کا تخلص ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے(حالیؔ)

۲۲) حالیؔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ کے شاگرد تھے۔( غالبؔ )

۲۳) ۔۔۔۔۔۔۔۔ نے غالبؔ کی سوانح لکھی۔(حالیؔ)

۲۴) غالبؔ کی زندگی کے بارے میں حالیؔ کی لکھی ہوئی سوانحی کتاب کا نام ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(یادگار غالبؔ)

۲۵) حالیؔ کا سنہ پیدائیش ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے( 1837ء)

۲۶) حالیؔ کا سنہ وفات ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے(1914ء)

۲۷) مضمون مرزا غالب کے اخلاق و عادات ۔۔۔۔۔۔۔۔ کتاب سے لیا گیا ہے(یادگار غالبؔ)

۲۸) حالی نے اردو کے مشہور شاعر ۔۔۔۔۔۔۔۔ کو حیوان ناطق کہا ہے۔(غالبؔ)

۲۹) ''غالب کو حیوان ناطق کے بجائے حیوان ظریف کہا جائے تو بہتر ہوگا''۔یہ خیال ۔۔۔۔۔۔۔۔ نے پیش کیا۔(حالی)

۳۰) غالب لوگوں سے ۔۔۔۔۔۔۔۔ سے پیش آتے تھے۔(خوش اخلاقی)

۳۱) اپنی ظرافت بھری گفتگو کے لئے ۔۔۔۔۔۔۔۔ مشہور تھے۔(غالبؔ)

۳۲) ۔۔۔۔۔۔۔۔ نے غریبوں کی مدد کے لئے اپنے انعامات بھی بیچ دئے۔(غالبؔ)

۳۳) غالبؔ کا سنہ پیدائیش ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور مقام پیدائیش ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے(1707۔آگرہ)

۳۴) غالبؔ کا انتقال ۔۔۔۔۔۔۔۔ سنہ میں ۔۔۔۔۔۔۔۔ شہر میں ہوا۔( 1861ء۔دہلی)

۳۵) نئے نئے خیالات شاعر ۔۔۔۔۔۔۔۔ کے کلام میں ذیادہ ملتے ہیں۔(غالبؔ)

۳۶) اردو کے مشہور شاعر ۔۔۔۔۔۔۔۔ کا مختصر اردو دیوان ہی ان کی شہرت کا سبب بنا۔(غالبؔ)

۳۷) بہادر شاہ ظفر کے استاد اردو کے مشہور شاعر ۔۔۔۔۔۔۔۔ تھے۔

۳۸) مخدوم کا سنہ پیدائیش ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور مقام پیدائیش ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے(4فبروری1908۔اندول ضلع میدک)

۳۹) مخدوم کا انتقال ۔۔۔۔۔۔۔۔ تاریخ کو ہوا۔(25اگسٹ۔1969)

۴۰) مزدوروں کی ترقی کے لئے ۔۔۔۔۔۔۔۔ نے کام کیا۔(مخدوم)

۴۱) مخدوم کے شعری مجموعوں کے نام ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہیں۔(سرخ سویرا۔گل تر)

۴۲) آپ کی یاد آتی رہی رات بھر چشم نم مسکراتی رہی رات بھر ۔یہ شعر ۔۔۔۔۔۔۔۔ کا ہے۔(مخدوم)

۴۳) رسالہ گونج کے ایڈیٹر کا نام ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔( جمیلؔ نظام آبادی)

۴۴) عبدالباری نام کے شاعر کا تخلص ۔۔۔۔۔۔ ہے۔( جمیلؔ نظام آبادی)

۴۵) سلگتے خواب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کا شعری مجموعہ ہے۔(( جمیلؔ نظام آبادی)

۴۶) رسالہ تمہید کے ایڈیٹر کا نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(عبدالقدیر مقدر) ہے۔

۴۷) پڑیئے گر بیمار مضمون ۔۔۔۔۔۔۔ نے لکھا۔(مشتاق احمد یوسفی)

۴۸) مشتاق احمد یوسفی کی کتابیں ۔۔۔۔۔۔۔ ہیں(خاکم بدہن۔زرگزشت۔چراغ تلے)

۴۹) مجتبیٰ حسین کا سنہ پیدائیش ۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(1932ء)

۵۰) اردو اخبار سیاست میں ہر اتوار ۔۔۔۔۔۔۔ مزاحیہ کالم لکھتے ہیں۔(مجتبیٰ حسین)

۵۱) مجتبیٰ حسین کو ۔۔۔۔۔۔۔ ایوارڈ ملا۔(پدم شری)

۵۲) مجتبیٰ حسین نے اپنے دوست اور اردو کے مشہور شاعر ۔۔۔۔۔۔۔ کے بارے میں خاکہ لکھا۔(سلیمان اریب)

۵۳) سلیمان اریب رسالہ ۔۔۔۔۔۔۔ نکالتے تھے۔(صبا)

۵۴) رسالہ صبا کا دفتر ۔۔۔۔۔۔۔ پر واقع تھا۔(معظم جاہی مارکیٹ۔مجردگاہ حیدرآباد)

۵۵) سلیمان اریب کی بیوی کا نام ۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(صفیہ اریب)

۵۶) عبدالحی شاعر کا تخلص ۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(ساحرلدھیانوی)

۵۷) ساحرؔ کا سنہ پیدائیش ۔۔۔۔۔۔۔ اور مقام پیدائیش ۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(1921ء۔لدھیانہ)

۵۸) ساحر کے شعری مجموعوں کے نام ۔۔۔۔۔۔۔ ہیں۔(تلخیاں۔پرچھائیاں)

۵۹) فلموں میں گیت لکھتے ہوئے ۔۔۔۔۔۔۔ مشہور ہوئے۔(ساحرؔ لدھیانوی)

۶۰) ہندوستان و پاکستان جنگ کے پس منظر میں نظم ۔۔۔۔۔۔۔ لکھی گئی۔(اے شریف انسانو)

۶۱) تاشقند معاہدہ کی سالگرہ کے موقع پر نظم ۔۔۔۔۔۔۔ لکھی گئی۔(اے شریف انسانو)

۶۲) مصلح الدین شاعر کا تخلص ۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(شاذ تمکنت)

۶۳) اب کے برس نظم ۔۔۔۔۔۔۔ نے لکھی۔( شاذ تمکنت)

۶۴) شاذ کی پہلی نظم ۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(والدہ کی یاد میں)

۶۵) شاذ نے ۔۔۔۔۔۔۔ یونیورسٹی سے ۔۔۔۔۔۔۔ سنہ میں پی ایچ ڈی کی۔(عثمانیہ یونیورسٹی۔1983)

۶۶) شاذ کے پی ایچ ڈی مقالے کا موضوع ۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔(مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے)

۶۷) شاذ کے شعری مجموعوں کے نام ۔۔۔۔۔۔۔ ہیں۔(تراشیدہ۔نیم خواب)

۶۸) شاذ کا انتقال ۔۔۔۔۔۔۔ میں ہوا۔( 18 اگسٹ 1984ء)

۶۹) افسانہ درد کے خیمے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نے لکھا۔(بیگ احساس)

۷۰)افسانہ درد کے خیمے کا مرکزی خیال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہے۔(ہجرت کا کرب)

۷۱)نظم تیری میری آس وہی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نے لکھی۔(محمد ایوب فاروقی صابر)

۷۲)نظم تیری میری آس وہی ہے میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔نظام پر تنقید کی گئی ہے۔(ذات پات۔چھوت چھات)

# VALUE EDUCATION I YEAR MODEL PAPER & NOTES

MODEL PAPER

Ist YEAR BA/B.COM/B.Sc -EXAMINATION 2013

Time : 2 Hours Max . Marks 50

**نوٹ: ذیل میں سے کوئی پانچ سوالوں کے جواب لکھئے۔** 5x10= 50

1 قدری تعلیم کی تعریف کیجئے اور موجودہ زمانے میں اس کی اہمیت بیان کیجئے۔( یا )
قدری تعلیم پر نوٹ لکھو اور اس کی وسعت اور اہمیت بیان کرو۔

2 قدری تعلیم کی اہمیت بیان کرو اور قدری تعلیم کے عمل میں خودی کی تلاش کو بیان کرو۔( یا )
قدری تعلیم کے ضمن میں درست سوچ' تعلقات اور طبعی سہولتوں کی اصطلاحات کے بارے
کے بارے میں آپ کیا سمجھتے ہیں۔

3 اصطلاحات مسرت اور خوشحالی کی تعریف بیان کیجئے۔اور انسان کی بنیادی خواہشوں کی تکمیل
کے طریقے بیان کیجئے۔( یا ) انسان کی خودی اور اس کے جسم کے بقائے باہم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں۔

4 ''انسانی جسم خودی کا آلہ ہے۔انسان کی خودی کی مسرت کیا ہے۔اس بارے میں تنقیدی نوٹ لکھو۔( یا )
رشتوں کی بنیادی قدر کے قیام میں اصطلاح ''بھروسہ'' کا مفہوم بیان کیجئے۔

5 درست جانچ کے ضمن میں سماج میں خوشحالی کا مفہوم کیا ہے۔( یا )
فطرت میں خوشحالی کی موجودگی کا مطلب کیا ہے۔

☆☆☆☆

# VALUE EDUCATION NOTES FOR I YEAR URDU MEDIUM STUDENTS 2014

## قدری تعلیم نوٹس برائے سال اول

نوٹ: مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تفصیل سے لکھو؟ ہر سوال کے 10 نشانات ہیں۔

**سوال: بہتر سماج کی تشکیل کے لئے ڈگری طلباء کو قدری تعلیم کا حاصل کرنا لازمی ہے واضح کیجئے۔**

جواب: **جواب: قدری تعلیم (Value Education) کا مفہوم:** قدری تعلیم (Value Education) کی اصطلاح ہم میں سے کئی افراد کے لئے نامانوس ہوگی لیکن ہم اس کے بارے میں اکثر سنتے رہتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ قدری تعلیم کا مفہوم کیا ہے اور بالخصوص پیشہ وارانہ ماحول میں اس کی اہمیت کیا ہے؟ اس نصاب میں ہماری زندگی سے متعلق چند اہم بنیادی مسائل کے بارے میں وضاحت کی جائے گی۔ یہ وہ مسائل ہیں جو ہماری خوشی اور مسرت، ہماری فلاح، ہماری خواہشات، ہمارے مقاصد اور زندگی میں کامیابی سے راست تعلق رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے قدری تعلیم اس بات سے بحث کرتی ہے کہ عالمی طور پر ہمارے لئے کونسی باتیں اور کونسے امور قدر رکھتے ہیں، اور ہماری دائمی انفرادی اور اور اجتماعی مسرت اور خوشحالی کے لئے کونسی باتیں سازگار ہیں۔ قدری تعلیم ہمیں اپنے طور پر، دیگر انسانوں کے ساتھ اور فطرت کے ساتھ مجموعی طور پر خوشحال رہنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ اس طرح کی تعلیم سے آگہی ہمیں اپنے پیشے کو کامیابی سے انجام دینے کے لئے اہم ہے۔ اس اہم ضرورت کی تعریف کرتے ہوئے آیئے اس مضمون کی وضاحت کرتے ہیں۔

**قدری تعلیم کی ضرورت:** ہم کئی چیزوں کے قدر رکھتے ہیں۔ اور اسی بنیاد پر ہم اپنے مقاصد اور عزائم طے کرتے ہیں۔ اور انہیں حاصل کرنے کی جستجو میں لگ جاتے ہیں۔ ہمارے لئے کیا قیمتی ہے اس کی وضاحت ضروری ہے۔ آیئے قدری تعلیم کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے اس پہلو کی تحقیقات کرتے ہیں۔

☆ **ہماری خواہشات کی درست شناخت:** تمام انسان خواہشات رکھتے ہیں۔ ہم ڈاکٹر، انجینیر، وکیل، فلمی ستارہ یا کچھ اور بننے کی تمنا رکھتے ہیں۔ ہم اپنے مستقبل کے لئے مختلف منصوبے بناتے ہیں۔ چاہے وہ فوری عمل طلب ہوں یا طویل مدتی۔ اس منصوبہ بندی میں ہماری ذاتی زندگی، ہمارا خاندان، ہمارا پیشہ، سماج میں ہمارا رول اور اس طرح کے دیگر امور شامل رہتے ہیں۔ تاہم ان منصوبوں کو حاصل کرنے کے لئے اپنی توانائی صرف کرنے سے قبل ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان میں ہماری بنیادی خواہش کیا ہے۔ اس کے لئے ہماری بنیادی خواہش کی نشاندہی ضروری ہے۔ بنیادی خواہش کی درست نشاندہی کے بعد ہم اپنے مقاصد اور ضمنی مقاصد کو بہتر طور پر طے کر سکتے ہیں اور ان کے حصول کی کوشش کرتے ہوئے ہم اپنی بنیادی خواہشات کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

☆ **ہماری خواہشات کی دائمی تکمیل کے لئے عالمی انسانی اقدار کی تفہیم:** کسی کی خواہشات کی شناخت ہی کافی نہیں ہے۔ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ ہم کیسے اپنی خواہشات کی تکمیل اور مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔ عام طور پر ہم اپنی معلومات اور یقین کی بنیاد پر اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم تجربات کرتے جاتے ہیں اور ان کی روشنی میں اپنی معلومات کو بہتر بناتے جاتے ہیں۔ اس طرح انسانیت نے ترقی کی ہے۔ اور یہ سلسلہ قدیم پتھر کے زمانے سے لے کر آج کی عصری سائینس و ٹیکنالوجی کی ترقی تک چلا آیا ہے۔ انسانی قدروں کی مکمل آگہی سے ہی ہمیں اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے یقینی راہ مل سکتی ہے۔

بنیادی طور پر ہم سب خوش رہنا چاہتے ہیں۔ اور ہماری خوشحالی کے لئے جو باتیں سازگار ہیں وہ ہمارے لئے قدر رکھتی ہیں۔ قدریں ہمارے افکار، برتاؤ اور حرکات کی بنیاد بنتی ہیں۔ جب ہم جان جاتے ہیں کہ ہمارے لئے قیمتی چیزیں کیا ہیں تو یہی قدریں ہمارے کام کی رہنما بن جاتی ہیں۔ جب ہم جان جاتے ہیں کہ ہم جو کر رہے ہیں درست ہے تو یہ کام اور یہ باتیں ہمیں اپنی بنیادی خواہشات کی تکمیل کی طرف لے جاتی ہیں۔ قدریں ہماری خوشی، کامیابی اور کمال کا ذریعہ بنتی ہیں۔ قدر پر مبنی مناسب کام کے ڈھانچے کے بغیر ہم یہ طئے نہیں کر سکتے کہ کوئی منتخبہ کام ضروری ہے یا غیر ضروری، صحیح ہے یا غلط۔ اس لئے قدر کی درستگی اور علاقہ کو درست طور پر سمجھنا بنیادی ضرورت ہے۔ قدری تعلیم اسی ضرورت کی تکمیل کا اہم حصہ ہے۔ جب ہم اقدر کو درست طور پر سمجھتے ہوئے زندگی گذارتے ہیں تو ہم دائمی مسرت کے ساتھ رہتے ہیں۔ اگر نہیں تو ہم محروم، مایوس اور ناخوش رہتے ہیں۔ آپ کی زندگی کی وہ کونسی قدریں ہیں جنہیں آپ اہم سمجھتے ہیں۔ کیا آپ نے جانچا کہ وہ قدریں آپ کی خوشحالی کے لئے سازگار ہیں۔ قدری تعلیم کے ذریعے اقدار کے علاقے کو تفصیلی طور پر سمجھنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں مختلف انسانی اقدار کی عالمگیریت کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ تب ہی ہم ایک خوشحال اور پر مسرت انسانی سماج کی تیقن دے سکتے ہیں۔

قدری تعلیم موجود تعلیمی نظام کی اہم گمشدہ کڑی ہے۔ جسے مناسب طور پر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں جان لینا چاہئے کہ ایک ماہر پیشہ ور

بننے کے لئے اچھی قدریں اور اچھی پیشہ وارانہ ہنرمندی کی ضرورت ہے۔ڈگری کی سطح کے طالب علموں کو خاص طور پر اور ساری دنیا کے انسانوں کو عام طور پر قدری تعلیم کا حاصل کرنا ضروری ہے۔انسان کو اپنی بنیادی ضروریات' خواہشات اور تعیّشات کے درمیان فرق معلوم کرنا چاہئے۔اور زندگی میں سکون دینی والوں باتوں کو اہمیت دینا چاہئے۔اور فرد اور سماج دونوں اعلی اقدار کے ساتھ زندگی بسر کریں تو ایک پرسکون اور حقیقی ترقی کا معاشرہ تشکیل پاسکتا ہے۔

**سوال: خود انضباطی (Sanyama- Self Regulationn) اور صحت (Swasthya-Health) کی انسانی زندگی میں اہمیت کیا ہے اور زندگی پر اس کے کیا اثرات پڑتے ہیں۔**

**جواب:** انسانی جسم خود سے منظّم نازک عضلات اور آلات کا مجموعہ ہے۔ہم جانتے ہیں کہ انسانی جسم میں کئی اعضا' خلیوں اور غدودوں کے افعال اور دل و دماغ کی سرگرمیوں سے مل کر کام کرتے ہیں۔دل خون کی سربراہی انجام دیتا ہے۔شش سانس لینے کا کام کرتا ہے۔اور خلیے زندگی کی بنیاد ہوتے ہیں۔انسانی جسم کے تمام افعال بہتر ہوں تو انسان صحت مند رہتا ہے۔اور انسانی جسم ایک پرسکون انسان کو طور پر کام کرتا ہے۔اور جسم کے ساتھ انسان کی روح بھی پرسکون رہتی ہے۔انسانی جسم صحت اور خود انضباطی پر مشتمل ہوتا ہے۔

**خود انضباطی self regulation- sanyama:** انسانی جسم کی پرورش' نگہداشت' تحفظ اور اس کے استعمال کے بارے میں انسان کے جذبہ ذمہ داری کو خود انضباطی self regulation کہتے ہیں۔انسان جانتا ہے کہ اس کے جسم کو وقت پر غذا کی ضرورت ہے۔حادثات اور موسم کی تپش سے بچانے کی ضرورت ہے۔اور اسے مناسب سمت میں کام پر لگانے کی ضرورت ہے۔اپنے جسم کے بارے میں انسان بہت فکرمند اور ذمہ دار ہوتا ہے۔اس کے اس احساس ذمہ داری کو خود انضباطی کہتے ہیں۔جب انسان اپنے جسم کے بارے میں فکرمند رہے گا تو وہ اسے بیمار ہونے نہیں دے گا اور ہمیشہ اس کی صحت کا خیال رکھے گا۔

**صحت: Health- swasthya** انسانی جسم کو بیماریوں اور حادثات سے بچائے رکھنا اور بیماری یا حادثہ ہوجائے تو بروقت علاج کرتے ہوئے جسم کو سکون کی حالت میں لینا صحت مندی کی علامت ہے۔انسان بیمار رہ کر کچھ کام نہیں کرسکتا اور اس کی زندگی بے مقصد ہوجاتی ہے اس لئے اسے صحت کے اصولوں پر اپنے جسم کو استعمال کرنا ہوگا۔آج ہماری زندگی میں حفظان صحت کا خیال نہیں رکھا جاتا بازاری اشیاء شوق سے کھائی جاتی ہیں جس سے مٹاپا اور دوسرے امراض پیدا ہورہے ہیں۔بیماری میں بھی ہم فوری علاج کی طرف توجہ دیتے ہیں اور جراثیم کش ادویات استعمال کرتے ہوئے بیماری کی حالت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں جب کہ بیماری کی وجوہات کا بھی علم ہونا چاہئے اور احتیاط علاج سے بہتر ہے کہ مصداق ہمیں بیمار ہوکر علاج کرنے کے بجائے بیمار ہونے سے بچنا چاہئے ورنہ دوؤں کے مضر اثرات سے بھی انسانی صحت بگڑ سکتی ہے۔ہم ماحول کو صاف رکھنے کی کوشش کریں۔آلودگی کے سبب بھی انسانی جسم کو بہت سے امراض لاحق ہیں۔ہماری غذا اصلی نہیں رہی۔اس میں ملاوٹ زیادہ ہوگئی ہے۔انسان کو اپنے جسم کو صحت مند رکھنے اور نظم وضبط کا پابند بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم مصنوعی طرز زندگی ترک کریں۔آرام پسندی اور مشینی زندگی کم کریں۔خود کام کریں۔قدرتی غذاؤں اور پھلوں اور ترکاریوں کا استعمال کریں۔صرف بھوک کے وقت ہی کھانا کھائیں۔بھوک سے کچھ کم کھائیں۔تلی ہوئی اور مرغن غذائیں کم کھائیں۔چہل قدمی کی عادت رکھیں اس سے جسم صحت مند ہوگا اور صحت مند جسم میں صحت مند دماغ ہوگا اور انسان کی زندگی خوشحال گذرے گی۔

**سوال: انسانی رشتوں میں اقدار کی کیا اہمیت ہے۔رشتوں اور اقدار سے متعلق 9 اہم امور کیا ہیں۔**

**جواب:** انسان سماجی حیوان ہے۔وہ سماج میں رہتا ہے۔اور سماج کی اکائی خاندان ہے۔جس میں ماں باپ بھائی بہن اور دیگر رشتہ دار رہتے ہیں۔خاندان میں دوسرے رشتے بھی ہوتے ہیں۔جیسے دادا۔دادی۔نانا۔نانی۔چاچا۔ماموں پھوپھا پھوپھو۔خالو۔خالہ بھانجہ بھتیجہ وغیرہ۔یہ رشتے ہماری زندگی کی حقیقت ہوتے ہیں۔ہم ان رشتوں کے درمیان پیدا ہوتے ہیں۔اس کے علاہ ہمارے دوست احباب ہوتے ہیں جن سے ہم بار بار ملاقات کرتے رہتے ہیں۔ہمارا پڑوس ہو یا ہمارا اسکول ہو یا ہمارا محلّہ ہمیں لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ہمارے اساتذہ ہوتے ہیں جن سے ہم دنیا کے علوم سیکھتے ہیں اور زندگی کو بہتر طور پر گذارنے کا طریقہ سیکھتے ہیں۔رشتے داروں اور دوستوں کے علاوہ ہم جس علاقے میں رہتے ہیں

وہاں ہماری ضروریات کی چیزیں حاصل کرنے کے لئے ہم دکان داروں اور بازار کے مختلف پیشے کے لوگوں سے بھی ملتے جلتے رہتے ہیں۔ جیسے ترکاری فروش۔ غلہ فروش۔ دودھ فروش۔ اخبار فروش وغیرہ۔ سماج کے یہ تمام لوگ ہماری زندگی میں کچھ نہ کچھ قدر اور اہمیت رکھتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے گھر۔ خاندان۔ محلّہ۔ اسکول اور سماج میں کئی افراد سے رشتہ داری اور تعلق رکھتے ہیں۔ ہم خوش رہیں اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے ملنے والوں اور رشتہ داروں سے بھی خوش رہیں تب ہی ایک خوشحال معاشرہ تشکیل پاسکتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں زندگی سے متعلق مثبت سوچ اور اقدار کا حامل ہونا چاہئے اور ان اقدار پر عمل پیرا بھی ہونا چاہئے۔ ہمیں مختلف موقعوں پر درست فیصلے کرنے ہونگے۔ اور انصاف کرنا ہوگا۔ کیا ہم ہر کام اور ہر موقع پر انصاف کرتے ہیں۔ کیا ہمیں انصاف خاندان میں ملے گا یا عدالت میں۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ ہم صرف اپنے خونی رشتے کے رشتہ داروں کو ہی اپنا مانتے ہیں۔ جب کہ یہ تصور غلط ہے۔ جب کہ دنیا کہ تمام انسانوں کے ساتھ ہمارا انسانیت کا رشتہ ہے۔ جس کی بنا ہم ایک دوسرے کے ساتھ پیار محبت سے رہنا چاہئے۔ ہم نے مادی ضرورتوں کی تکمیل کے ساتھ رشتے داروں کو باندھ لیا ہے۔ جیسے دولت جائیداد وغیرہ۔ اگر ہمیں کسی سے مالی فوائد حاصل ہوتے ہیں تو ہم اسے اچھا سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ تعلق بنائے رکھتے ہیں۔ اسی طرح آج کے نوجوان دولت کمارہے ہیں اور اپنی ذات پر خرچ کررہے ہیں۔ وہ اپنے بوڑھے والدین کا خیال نہیں رکھ رہے ہیں۔ جس وقت بوڑھوں کو اپنی جوان اولاد کی ضرورت تھی اس وقت نوجواں اپنے والدین کو اولڈ ایج ہوم میں داخل کرارہے ہیں۔ اور انہیں دنیاوی سہولتیں فراہم کرنے کے دھوکے میں ہیں جب کہ بوڑھے والدین کو گھر کے ساتھ جوان اولاد کے سہارے اور ہمدردی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رشتے نبھانے میں دولت ہی سب کچھ نہیں بلکہ پیار محبت اور ہمدردی کے جذبے بھی ہیں۔ انسان کو اپنی خوشحالی اور مسرت کے حصول کے لئے دوسروں سے رشتے نبھانے پڑتے ہیں۔ رشتوں کو بہتر طور پر نبھانے کے لئے ہمیں نو طرح کے جذبوں کے اظہار کی ضرورت پڑتی ہے وہ اس طرح ہیں۔

رشتوں میں اقدار نبھانے کے 9 جذبے: رشتوں میں اقدار کے اظہار کے 9 جذبے اس طرح ہیں۔ 1) بھروسہ۔ 2) عزت۔ 3) چاہت۔ 4) نگہداشت۔ 5) رہبری۔ 6) تعظیم 7 ) شان۔ 8) اظہار تشکر۔ 9) محبت۔ رشتے نبھانے میں یہ جذبے اہم ہیں جن کے بارے میں جاننے سے انسان خوشحال زندگی گذار سکتا ہے۔

**سوال: بھروسہ کس طرح انسانی اقدار کی بنیادی قدر ہے واضح کیجئے۔**

**جواب:** بھروسہ: بھروسہ رشتے نبھانے میں اہم جذبہ ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ خوش رہے۔ لوگ خوش رہیں۔ لوگ چاہتے ہیں کہ وہ خوش رہیں اور سامنے والا بھی خوش رہے۔ انسان کو اپنے کام انجام دینے کے لئے کبھی دوسروں پر بھی بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ کیا ہم اجنبیوں پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم خود سے سوال کریں کہ ہم دوسروں سے خوفزدہ کب رہتے ہیں اور دوسروں پر بھروسہ کب کرتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ ہم کسی شخص کے بارے میں اس وقت بھروسہ قائم کرتے ہیں جب ہمیں یہ یقین ہوجائے کہ سامنے والا ہماری بھلائی اور مسرت کے لئے کام کرے گا۔ جب ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ سامنے والا شخص مجھے خوشحالی اور مسرت فراہم نہیں کرے گا تو ہم اس شخص سے خوفزدہ رہیں گے۔ یہ بات تو ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم ہمیشہ خوش رہنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ہم بھی اپنے آپ کو خوشحال رکھنے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ جب کہ دوسرے ہمیں خوشی دیں گے یہ سب کے بارے میں نہیں کہہ سکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ سب لوگ ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں اور ہمیں خوش رکھیں۔ یہ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو خوش رکھیں اور اس کی جستجو کریں۔ جب ہم دوسرے کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ کیسا برتاؤ کرے گا تب ہمارا یہ عمل جائزے پر مبنی ہوگا کہ وہ شخص کیسا ہے۔ اگر سامنے والا ہمارے بارے میں اچھا سوچتا ہے تو ہم اس سے کام لینے کے بارے میں بھروسہ کریں گے نہیں تو مخالفت کریں گے۔ ہم کسی کے بارے میں غصے میں نہیں آنا چاہتے لیکن لوگوں کے برتاؤ سے ہمیں غصے میں آنا پڑتا ہے۔ یہی حال ہماری رشتے داری میں بھی ہے کہ ہم اپنے قریبی لوگوں پر بھی بھروسہ نہیں کر پاتے کیونکہ ہم جس معیار کا کام چاہتے ہیں ہمارے اپنے بھی ہمارے ساتھ ویسا کام کرنے تیار نہیں ہیں۔ جہاں تک بھروسے کی بات ہے اکثر یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ ہم اجنبیوں پر کیسے بھروسہ کریں۔ ہم ان لوگوں پر کیسے بھروسہ کریں جو ہمارے بارے میں برے خیالات رکھتے ہیں۔ اگر ہم جان بوجھ کر کسی پر بھروسہ کرلیں تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ یا کسی شخص پر اندھے

بن کر بھروسہ نہ کرو۔ اجنبیوں پر بھروسہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے دونوں کے درمیان شناسائی بڑھے لوگ ایک دوسرے کو جانیں۔ اگر اندازہ ہو کہ اجنبی شخص نقصان دہ نہیں ہے تو اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ کچھ لوگ ہمیں نقصان پہونچانا چاہتے ہیں اور ہم ان کے نقصان سے کیسے بچیں۔ جیسے ہم اپنے مکان میں رہتے ہیں اور کوئی ہمارے مکان میں چوری کا ارادہ کر رہا ہے۔ وہ چوری کرتے ہوئے اپنی مالی خواہشات غلط طریقے سے پوری کرنا چاہتا ہے۔ ایسے اشخاص کے لئے ہمارا طریقہ کار یہ ہونا چاہئے کہ سماج میں ایسے کام کرنے چاہئیں کہ لوگوں کو روزگار ملے اور لوگ چوری جیسے عمل سے باز آئیں اس سے ہمارا مکان بھی محفوظ رہے گا اور غریب لوگوں کو روزگار کے مواقع بھی ملنے چاہئیں۔ تاکہ وہ چوری جیسے کام نہ کریں۔

کچھ لوگ ہم سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں لیکن ہمیں فائدہ نہیں دیں گے کچھ لوگوں کر کردار اچھا نہیں ہوتا۔ اس کے باجود ہمیں اچھے برتاؤ کے ساتھ ایسے لوگوں کا رویہ بدلنا ہوگا تب ہی وہ بھروسے کے قابل ہونگے۔ یہی معاملے کسی پر اندھا بن کر بھروسہ کرنے کا ہے۔ ہم سامنے والے کو بالکل ہی برا سمجھتے ہیں لیکن اسے اچھا بننے کا موقع ملنا چاہئے تب ہی وہ آپ کے بھروسے کے قابل بنے گا۔ اس طرح معلوم ہوا کہ بھروسہ رشتوں کی بنیاد ہے۔ ہم اپنی خوشی کے لئے لوگوں کا بھروسہ چاہتے ہیں لیکن ہمیں بھروسہ ملے اس کے لئے ہمیں بھی لوگوں کو خوش رکھنا ہوگا۔ اس سے ایک بھروسہ مند ماحول بنے گا اور لوگوں کی زندگیوں میں خوشیاں پلٹ کر آئیں گی۔

**سوال: انسان جسم اور روح SELF(I) AND BODY کا مجموعہ ہے واضح کیجئے۔**

**جواب:** انسان۔ جسم سے زیادہ اور بھی کچھ ہے: دنیا میں جتنے بھی انسان ہیں وہ ساخت اور ترتیب کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ جیسے انسان کے دو کان دو آنکھ دو ہاتھ دو پیر ہونا وغیرہ۔ ان کے علاوہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جسم میں زندگی بھی ہوتی ہے جسے روح کہہ سکتے ہیں۔ جسم میں موجود روح یا جان انسان کو مختلف حرکتیں کرنے اور کام کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ جیسے دیکھنا' بات کرنا' سننا' چلنا' کھانا' پینا وغیرہ۔ اس کے علاوہ انسان سوچتا ہے۔ محسوس کرتا ہے۔ اور وہ کچھ عقائد بھی رکھتا ہے۔ اسی طرح کسی انسان کے بارے میں اس کے جسم اور روح کے بارے میں جاننا مشکل ہے۔ اس طرح انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ انسان کہتا ہے کہ میں خوش ہوں۔ میں تھکا ہوا ہوں۔ اس طرح ہر انسان اپنے بارے میں علم رکھتا ہے۔ انسان صبح نیند سے بیدار ہونے سے لے کر شام میں سونے تک کئی کام کرتا ہے۔ اور ان کاموں کے دوران وہ اچھے اور برے کا فرق کرتے ہوئے اپنے لئے بہتر بات کا انتخاب کرتا ہے۔ اور یہ انتخاب کا کام جسم نہیں کرتا بلکہ اس کا دماغ اور اس کی خودی اور روح کرتی ہے۔ جب انسان چلتا ہے تو اس کا فیصلہ اس کے پیر نہیں کرتے بلکہ اس کی خودی کرتی ہے۔ جس کا تعلق دل و دماغ سے ہوتا ہے۔ جب ہم تفریح کرتے ہیں تو ہمارا جسم خوش نہیں ہوتا بلکہ ہم خوش ہوتے ہیں جس کا تعلق دل و دماغ سے ہے کہ تفریح کے بعد فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ اس طرح انداز ہو ہوتا ہے کہ انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔

خودی کو سمجھنا۔ جسم اور روح کے مجموعے کے طور پر: انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ اور وہ خواہشات کے تحت ان کی تکمیل کے لئے کام کرتا ہے۔ آئے دیکھیں کہ انسانی جسم کی خواہشات کیا ہیں۔ ہم سب کو بھوک لگتی ہے۔ جسمانی نشونما اور توانائی کے لئے غذا اور پانی ضروری ہے۔ اور انسان غذا اور پانی استعمال کرتے ہوئے درکار توانائی حاصل کرتا ہے۔ یہ انسانی جسم کی بنیادی ضرورتیں ہے۔ جسم کو موسم کے اثرات سے بچانے کے لئے لباس اور مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمیں مختلف کام انجام دینے کے لئے آلات کی ضرورت پڑتی ہے۔ جیسے سفر کرنے کے لئے بس یا کار کی۔ تقریر کرنے کے لئے مائیکروفون کی۔ اگر سواری نہ ہو تو انسان کو پیدل چلنے میں

تھکان کا احساس ہوگا۔ اسی طرح مائیک نہ ہو تو بڑے مجمع میں چیخ کر بات کرنا پڑے گا۔ جس سے جسم متاثر ہوگا۔ اس لئے انسانی جسم کے بہتر استعمال کے لئے مناسب آلات اور اوزار بھی ضروری ہیں۔ اب ان مثالوں کی روشنی میں دیکھیں کہ ہمارے جسم کی نگہداشت کون کرتا ہے۔ جس کا جواب میں ہوگا۔ یعنی ہر فرد اپنے جسم کی ضروریات کے اعتبار سے ان کی تکمیل کرتا ہے اور جسم کا مناسب خیال رکھتا ہے۔ اسی طرح انسان کو عزت' بھروسہ اور خوشحالی کی بھی ضرورت ہے اور یہ ضروریات اس کی خودی اور روح کے لئے ضروری ہیں۔ اب سوال کیا جائے کہ بھروسہ اور خوشی کس کے لئے ضروری ہے۔ جسم کے لئے یا خودی یا روح کے لئے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ضروریات ہماری خودی اور روح کے لئے ضروری ہیں۔

اس طرح غذا پانی اور دیگر مادی ضروریات جسم کی نشونما کے لئے ضروری ہیں جنہیں ہم جسم کی طبعی ضروریات کہہ سکتے ہیں اور خوشی مسرت' بھروسہ عزت وغیرہ روحانی ضروریات ہیں۔

جسمانی ضروریات وقتی ہوتی ہیں: انسان کو جب بھوک لگتی ہے تو وہ بھوک مٹانے کے لئے کھانا کھاتا ہے۔ جب وہ پیٹ بھر کے کھانا کھالے پھر کوئی اسے زبردستی کھلائے تو وہ اس کے ساتھ دوستی یا ہمدردی نہیں بلکہ زبردستی ہوگی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جسمانی ضروریات عارضی ہوتی ہیں۔ اسی طرح سردیوں میں ہم گرم سوئٹر پہنتے ہیں جو دیکھنے میں بھی اچھا لگتا ہے۔ چونکہ وہ دیکھنے میں اچھا ہے اس لئے ہم سوئٹر گرمیوں میں بھی نہیں پہنتے۔ سوئٹر صرف موسم کی سردی سے بچنے کے لئے وقتی طور پر پہنا جاتا ہے۔ ہم گھر میں بھی وقت کے اعتبار سے رہتے ہیں۔ صبح سے شام تک گھر میں مقید نہیں رہتے بلکہ زندگی کی ضروریات کے لئے باہر بھی نکلتے ہیں۔ اسی طرح سفر کرنے کے لئے جب گاڑی استعمال کرتے ہیں تو ہمیشہ گاڑی پر نہیں رہتے۔ ضرورت کی حد تک گاڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ ان مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ جسمانی ضروریات وقتی اور عارضی ہوتی ہیں۔ اور مسلسل جاری نہیں رہتیں۔

روحانی ضروریات دائمی ہوتی ہیں: اس طرح جسم کی ضروریات عارضی ہوتی ہیں۔ تو کیا خودی اور روح کی ضروریات بھی عارضی ہوتی ہیں؟ اب ہم اپنے سے سوال کریں کہ کیا مجھے عزت کچھ وقت کے لئے چاہئے یا ہمیشہ کے لئے۔ کیا لوگ مجھے کچھ وقت کے لئے اچھا سمجھیں یا ہمیشہ کے لئے۔ ان سوالوں کے جواب دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہمیں عزت اور خوشی مسلسل اور ہمیشہ کے لئے چاہئے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے بھی غمزدہ رہنا نہیں چاہتے۔ اور نہ ہی سماج میں بے عزت رہنا چاہتے ہیں۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری جسمانی ضروریات تو عارضی ہیں تاہم خودی یا روحانی ضروریات مستقل ہیں۔ اب تک کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ

☆ جسم کی ضروریات غذا' لباس' مکان اور طبعی سہولتیں عارضی ہوتی ہیں۔

☆ خودی اور روح کی ضروریات خوشی' بھروسہ اور عزت ہیں۔ یہ طبعی حالت میں نہیں ہوتیں لیکن ان کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔

جسم کے لئے طبعی ضروریات مقداری ہوتی ہیں: جسم کے لئے غذا۔ لباس۔ سواری۔ مکان اور دیگر مادی ضروریات مقداری ہوتی ہیں۔ انسان کو بھوک مٹانے کے برابر غذا کی ضرورت ہے۔ جسم کے لئے دو چار کپڑے کے جوڑے۔ رہنے کے لئے ایک عدد مکان اور سواری کے لئے ایک گاڑی۔ انسان کو اپنی طبعی ضروریات مٹانے کے لئے جو ضروریات درکار ہیں وہ تسلی بخش مقدار میں ضروری ہیں سارے نہیں۔

خودی اور روح کے لئے ضروریات معیاری ہوں: انسان کی روح اور خودی کے لئے درکار ضرورتیں خوشی' مسرت' خوشحالی' عزت اور شہرت کو مقدار کے طور پر تولا نہیں جا سکتا بلکہ سماج میں ان کا پیمانہ معیار ہے۔ ہم پہلے سے طے شدہ معیارات پر ان باتوں کو پرکھتے ہیں اور مطمئن ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان سماج میں عزت چاہتا ہے۔ اب عزت کا معیار کیا ہے۔ ایک بادشاہ کی عزت ہوتی ہے ایک وزیر اعظم کی عزت ہوتی ہے اور ایک عام شہری کی۔ انسان جس سطح کی زندگی گذارے گا اس سطح پر لوگ اس سے اچھے انداز میں پیش آئیں تو وہ اپنی عزت محسوس کرے گا۔ اگر لوگ اس کی سماجی حیثیت سے گرا کر اس سے غلط برتاؤ کریں تو اسے اچھا نہیں لگے گا۔ اس طرح خودی اور روح کی ضروریات کے معیاری ہونے کا پیمانہ تسلی ہے کہ لوگ اس سے مطمئن رہیں۔

جسم اور روح کی ضروریات کی تکمیل کیسے ہوتی ہیں؟ جسم کی مادی ضروریات جیسے غذا۔ لباس۔ مکان۔ سواری وغیرہ کی تکمیل انسان مناسب طبعی حالات جیسے محنت کر کے دولت کمانا اور دولت سے جسمانی مادی ضروریات کی تکمیل کرنا ہیں۔ اسی طرح خودی اور روح کی ضروریات مسرت' عزت' شہرت وغیرہ کی تکمیل مناسب سمجھ بوجھ اور مناسب احساسات کے ذریعے ہوسکتی ہیں۔ انسان کو خوشی ملے لیکن وہ اسے محسوس نہ کر سکے تو یہ اس کی تربیت کی غلطی ہوگی کہ وہ اپنے لئے اچھے اور برے کی تمیز نہیں رکھتا۔ جسمانی ضروریات اور روحانی تسکین بھی اعتدال سے ہوں اور مرضی سے ہوں تو انسان مطمئن رہے گا۔ اگر وہ آرام دہ کمرے میں ہو لیکن اس کے مقابل ایسا شخص ہو جو اسے پسند نہ ہو تو وہ آرام دہ کمرے میں بھی مطمئن نہیں رہے گا بلکہ بے چین رہے گا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جسمانی ضروریات کے ساتھ انسان کو دماغی اور روحانی چین وسکون بھی ہونا ضروری ہے۔ انسان کے پاس بے حساب دولت ہے جس سے وہ ہر مادی ضرورت خرید سکتا ہے لیکن وہ صحت مند نہیں اور نہ ہی خوش ہے تب وہ دولت سے سکون

حاصل نہیں کرسکتا۔اس لئے انسان کومسرت اورخوشحالی سے زندگی گذارنے کے لئے مادی ضروریات کے ساتھ دماغی سکون، خوشگوار اور سازگار حالات اوراچھے تعلقات کی ضرورت ہے۔

**مادی اور روحانی خوشحالی کیسے حاصل ہو؟** انسان مادی اور روحانی خوشحالی کے حصول کے لئے کچھ باتوں کوایک دوسرے میں ملا دے رہا ہے۔ انسان دووقت کی روٹی کے لئے مارامارا پھر رہا ہے۔اور دولت کے حصول میں لالچی ہوگیا ہے۔حرام حلال جائز ناجائز کی تمیز کئے بغیر دولت حاصل کررہا ہے لیکن اسے روحانی سکون حاصل نہیں ہورہا ہے۔ وہ مطمئن نہیں ہے۔ مادہ پرست دنیا میں رہتے ہوئے انسان ضرورت اورعیش میں فرق کئے بغیر عالیشان بنگلہ، اے سی، کاراوراس طرح کی بھاری چیزوں کے حصول میں لگ گیا ہے۔اور جب وہ کسی طرح ان تعیّشات کو پالیتا ہے تب بھی وہ ان سے حقیقی مسرت حاصل نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس کی سوچ درست نہیں ہے اوروہ ذہنی اندیشوں میں گرفتار ہوکرعیش کے سامان میں رہتے ہوئے بھی عیش اورسکون حاصل نہیں کرسکتا۔انسان سمجھتا ہے کہ عالیشان اشیاء رکھنے سے سماج میں اس کی عزت بڑھے گی لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ اس سے حسد کرنے لگیں۔اور یہ عالیشان چیزیں انسان کے لئے عزت کے حصول کے بجائے حسد کا ذریعہ نہ بن جائیں۔

**خلاصہ گفتگو:** اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کا وجوداس کے جسم اوراس کی روح کا مجموعہ ہے۔انسان زندہ رہنا چاہتا ہے اوروہ اپنے جسم کو زندگی کے آلہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔صرف زندہ رہنا انسان کا مقصد نہیں بلکہ وہ خوش رہنا چاہتا ہے۔جسم کی ظاہری ضروریات روٹی کپڑا اور مکان ہیں۔جسم کو بہترطور پر استعمال کرنے کے لئے ان سازوسامان کی ضرورت پڑتی ہے جیسے سفر کے لئے گاڑی علاج کے لئے دواوغیرہ۔آج انسان اپنی روحانی ضروریات کے بارے میں مناسب علم نہیں رکھتا اس لئے وہ وسائل کے ہونے کے باوجود پریشان ہے۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان اپنی روحانی مسرت کا بھی خیال رکھے۔صرف طبعی سہولتیں حاصل کرلینے سے اسے خوشی نہیں مل سکتی اور نہ ہی وہ دائمی مسرت حاصل کرسکتا ہے۔اس کے لئے اسے ان کاموں کا بھی انتخاب کرنا ہوگا جو اسے ذہنی اور روحانی مسرت دلا سکے۔

**سوال: انسانی رشتوں میں اقدار کی اہمیت بیان کیجئے۔اورانہیں کیسے پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔**

**سوال: نگہداشت، رہنمائی، عظمت، عزت جیسے جذبات کے بارے میں لکھو؟**